سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر
تصنیف
مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ
جسے
رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے
مرتبہ
عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا
فروری
۱۹۳۷ء

دلی کی آخری بہار

دلی، بن بن کر بگڑی اور بگڑ بگڑ کر سنوری، سنور سنور کر اُجڑی اور اُجڑ اُجڑ کر بسی مگر غدر ۱۸۵۷ء نے نوشاجہان آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی پیدائش غدر کے گیارہ سال بعد کی تھی جب دلی کا سہاگ اُجڑ چکا تھا مگر چند بچے کھچے خاندان دلی والوں کی خصوصیات کی یادگار رہ گئے تھے جن کے دم سے تعلقات کا ہرا بھرا باغ اپنی آخری بہار دکھا رہا تھا اور محبت اور خلوص کے سدا بہار پھول کھل رہے تھے۔ اجڑے دیار کے اس آخری دور میں بھی وضع داری کی نہریں لہریں لے رہی اور صداقت کے چشمے پھوٹ رہے تھے مگر ایک پچاس برس کے اُلٹ پھیر میں حضرت علامہ مغفور کے دیکھتے ہی دیکھتے دلی کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اُن کے بچپن میں جو باتیں پرانی مشرقی تہذیب اور اسلامی شرافت و اخلاق کے خلاف سمجھی جاتی تھیں جدت پسندی اور مغرب پرستی نے انہیں شائستگی اور ترقی کا معیار قرار دیا اور جو باتیں اُس وقت ہنر تھیں وہ عیوب میں شمار ہونے لگیں۔ دلی کی حکومت بدلی، تہذیب بدلی، زبان بدلی، معاشرت بدلی، غرض تغیر کی صدائیں اور ترقی کے نعرے چپے چپے اور کونے کونے سے بلند ہونے لگے دلی کے اس انقلاب کا علامہ مغفور کی طبیعت پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اور اُنہوں نے جہان آباد کے متعدد مرثیے لکھے۔ کونسی آنکھ ہوگی جس نے "وداعِ ظفر" اور "بیلہ میں میلہ" میں بربادیٔ دہلی کے افسانے پڑھ کر دو آنسو نہ گرائے ہوں۔ ان تصانیف کے علاوہ علامہ مغفور نے متعدد مضامین میں بھی جہان آباد کے دورِ گذشتہ کی بہار دکھا کر ہزاروں دردمند دلوں کو تڑپایا تھا۔ مصورِ غم علیہ الرحمۃ کے یہ آنسو لٹریچر کے وہ گراں بہا موتی ہیں جن کی چمک دمک ہمیشہ اسے منور رکھے گی اور جو پچیس سال سے ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ انہیں پرو کر یہ لڑی تیار کرنے کا ارادہ کئی سال سے تھا مگر آہ اس کی تکمیل اس وقت ہو رہی ہے جب حضرت والد مغفور (خدا ان کے مزار پر اپنی رحمت کے بے شمار پھولوں کا مینہ ہمیشہ برساتا رہے) اسی زمین پر جس کا ذرہ ذرہ انہیں عزیز تھا خاک کی دوشالہ اوڑھے ہزاروں من مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہے ہیں!! آہ اُجڑے دیار کی آخری بہار کا آخری پھول بھی مُرجھا گیا!!

۴ر جنوری ۱۹۳۷ء

رازق الخیری

فہرست

شاہجہاں آباد کے سدابہار پھول

آج بھی، کہ شاہجہان آباد اپنے ساتھ اپنے مکین، گہری گور میں سُلا چکا۔ میٹھی باتوں کے رسیا، اور اچھی صورتوں کے کھوجی۔ مطالعہ کی دوربین سے، ایوان تاریخ میں اس مقام پر پہونچ جاتے ہیں، جہاں، سریلی تانیں، اور واقعی انسان دُنیائے فانی سے مٹ کر، اپنی بقائے ابدی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ماضی، حال پر ہنس رہی ہے اور چشم حیرت ان لوگوں کا مُنہ تکتی ہے۔ جو موجودہ زمانہ کو ترقی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ دل مجروح چاروں طرف ڈاواں ڈول پھرتا ہے، مگر اس آن بان کے انسان، نظر نہیں آتے، جو آج، شاہجہان آباد کے کھنڈروں میں، آرام کر رہے ہیں، بیسویں صدی عیسوی کا تمدن، ان بھولی صورتوں اور سیدھے سادے لوگوں کا مضحکہ اُڑائے، دیوانہ ٹھیرائے، اور سودائی بنائے مگر انسانیت، ان کی بے لوث زندگی کی قسم کھا رہی ہے۔ اور خلوص کے فرشتے انکی باتوں پر مدۃ العمر پھول برسائیں گے۔

عزیزو! انصاف کی آنکھ سے دیکھنا، اور ایمان سے کہنا، ستر برس پہلے کی دلی آنکھ کے سامنے ہے.......... مومن، غالب، ذوق، و آزردہ جیسی شکلیں

...... جن پر شاہجہان آباد ناز کر رہا ہے، دنیائے حیات میں موجود ہیں، مومن خان کے مکان پر مجلس احباب جمی ہوئی ہے۔ گرمی کے دن ہیں۔ اور خان صاحب کے پختہ مکان، کی چار دیواری پر، جس کے آثار اب تک چیلوں کے کوچہ میں موجود ہیں، مٹی کے آبخورے، ہچکولیوں کے پانی سے بھرے دور تک رکھے ہیں، آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا ہے، پردیسی، دُور دُور کے تھکے ہارے بیتابانہ ٹوٹ رہے ہیں، دھیما نوکر موجود ہے، ادھر آبخورہ خالی ہوا، اُدھر اُس نے بھرا، اور رکھا۔ ایک رات کہ، چاندنی نکھری ہوئی تھی، نواب نصیر الدین خان صاحب سے ملنے آئے۔ پٹھان تھا تو سچ مچ کا نواب زادہ، مگر سخن کا شیدا، اور خیال کا دلدادہ حُسن عقیدت کا سُرمہ آنکھ میں تھا، اور نشتر مضامین کا زخمی دل پہلو میں جُھکا، ہاتھ چومے، سر پر رکھے، آنکھوں سے لگائے، مشتاق آنکھیں، ابھی سیر نہ ہوئی تھیں، کہ ایک نو برس کا لڑکا، جس کے مُنہ، پر، بچپن کے پھُول کھل رہے تھے، اور عمر نادانی کی چینور ہلا رہی تھی، دُور سے آیا، آبخورہ، ہاتھ میں لیا، اور نواب کی باتوں میں محو ہو گیا۔ ناتجربہ کاری، بچے کو کھینچ کر، میزبان اور مہمان، دونوں کے قریب لے آئی، دامن داغ، پر وہ سدابہار پھول، جو خان صاحب کے مُنہ سے جھڑ رہے تھے، رکھنا جاتا تھا، کہ آبخورہ ہاتھ سے چھُوٹ گیا، اور پانی کی چھینٹیں سب تک پہونچیں، مولانا حسن کی تیوری پر بل آ گیا، اور کہنے لگے۔

"خان صاحب یہ کیا مداری کا تماشہ بنا رکھا ہے، بچہ بوڑھا بڑھا جوان، جو ہے سو چل ڈھتے ہیں"

کپڑے خانصاحب کے بھی لت پت ہوئے تھے، مگر ذرا چشم حقیقت سے،

اس دنیا کا ایک ایک ذرّہ دیکھو، اور کہو۔

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

خان صاحب نے فرمایا "مولانا! کدھر خیال ہے، ذوق نے کیا اچھی بات کہی ہے

فیض گر چاہنا ہے فیض کے اسباب بنا،
پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا،

میاں! اُس کے تو ہم لائق نہیں، تو کیا اس سے بھی گئے گذرے ہوئے!"

پڑھنے والے، ان سطروں پر ٹھٹے لگائیں، چاہے سمع خراشی سمجھیں، مگر میں اپنے دل کا کیا کروں، عالم خیال میں، جب واقعات ان صورتوں کو سامنے لا بٹھاتے ہیں تو پہروں زیارت کرتا ہوں، گرد و پیش نظر ڈالتا ہوں، کہ شاید اب بھی کوئی نظیر نظر آجائے، مگر رفتار زمانہ دل کے کان میں جھک کر کہتی ہے "دیوانے! تمدن بدل گیا، ہوائیں پلٹ گئیں، اب وہ لوگ کہاں؟ وہ دن ختم ہوئے اور راتیں سحر ہوئیں۔"

زمانہ پانچ برس آگے نکل آیا، نواب نصیر الدین خان کی ہڈیاں گل کر خاک ہوئیں، پنجابی کٹڑہ جس کی خاک ریلوے سٹیشن کو گود میں لئے موجود ہے۔ اور جو اپنے ساتھ اپنے دیکھنے والوں کو بھی برباد کر چکی آباد ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ سلیم شاہی جوتی کی قیمت دلی کے چار ٹکے ہیں، کٹڑہ کی مسجد اور مدرسہ میں علوم کے دریا بہہ رہے ہیں، اور ان طلبا کا جم غفیر سیراب ہو رہا ہے، جن کی ایک

یادگار مولانا نذیر احمد مرحوم تھے۔

دُور دُور کے لوگ، مدرسہ اور بانیٔ مدرسہ کی زیارت کو آ رہے ہیں، اور علم کے شیدا، سینکڑوں ہزاروں کوس سے گھر بار چھوڑ، اپنی زندگی، خمیری روٹی، اور چنے کی دال پر بسر کر رہے ہیں۔ جمعہ ان طلبار کے واسطے سچ مچ عید المسلمین ہے۔ کہ رؤسار کھانا بھیجتے ہیں اور دعائیں لیتے ہیں۔

مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم، جن کے مزار پاک پر آثار الصنادید فاتحہ کے پھول چڑھا رہی ہے۔ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ مغرب کی نماز ہو چکی۔ شبو حلال خور خدا رسول کی امان کہتا ہوا سامنے آیا، بیٹی کے بیاہ کا بلاوا دیا۔ اور کل شام کی دعوت کی۔

وہی دُنیا ہے، اور وہی دُنیا کے بسنے والے، مگر وہ لوگ کہاں؟ دل ان کی پاک روحوں پر، خون کے آنسو گراتا ہے، اور سیر نہیں ہوتا، آنکھیں اُن کی مقدس صورتیں چاروں طرف، ڈھونڈھتی ہیں، اور نہیں پاتیں کیسی خوبی کے انسان تھے، اپنی آن ٹوٹ جائے مگر دوسرے کا دل توڑنا نہ جانتے تھے، زمانہ ان صورتوں کو برباد اور ان کی ہڈیاں خاک کر چکا، مگر مٹنے والے اپنے کارناموں کی، ایسی یاد چھوڑ گئے، کہ مجھ جیسے دیوانے، مدۃ العمر سر پٹکیں گے، اور اُن کا نظیر نہ پائیں گے، کجا مولوی عبد الخالق جیسا، عالم متبحر جس کے نام پر بڈھا بادشاہ[۳] تادم حیات، جنس عقیدت کے جواہر نثار کرتا رہا، کجا، شبو حلال خور۔

---

[۱] حضرت علامہ مغفور کے پھوپا [۲] حضرت علامہ مغفور کے پردادا [۳] بہادر شاہ ظفر۔

بھائیوں، چند لمحہ کے واسطے، چشم ظاہری بند کرلو۔ موجودہ دلّی کو بھول جاؤ۔ حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنا عالم خیال، اُس بستی میں پہونچا دے گا، جہاں ہر چہرہ وضع داری کے زیور سے مُزیّن ہوگا، ایسے نفوس بہت سے نظر آئیں گے۔ جن کی موت پر جان پہچان اور پڑوسی تک خون کے آنسو گرائیں۔

دیکھ دیکھ، چشم بینا، غور سے دیکھ، مولوی عبدالخالق، شبو حلال خور کے ہاں دعوت کھا رہے ہیں، دیکھ! دل بھر کر دیکھ، اب یہ سماں نظر نہ آئے گا۔ اور یہ قلب انسانی پر حقیقی حکومت کرنے والے بزرگ ہمیشہ کو اوجھل ہو جائیں گے! کیسی اچھی محفل جمی ہوئی ہے۔ کچّی دیواروں کا گھر، مٹّی کی دیوے، میلے کچیلے لوگ مگر وہ ہیں یہ لوگ جن کی آنکھ کا ہر اشارہ پرکھنے والوں کو دل کے خلوص کا پتہ دے رہا ہے حقیقی مسرت کے پھول ان کے چہروں پر کھل رہے ہیں۔ ۵۷ء جس نے شاہجہان آباد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گذر چکا، ایک پندرہ ہی برس میں دلّی کچھ کی کچھ ہوگئی اقلیم سخن کو ایک اشارے سے مسخر کرنے والے تاجدار اور قلوب انسانی کو ایک تان سے موہ لینے والے خوش الحان چل بسے شعرا ر نامدار نے قبریں بسائیں، دونوں کے کام آنے والے ختم ہوئے، مگر کچھ بچے کھچے، بڈھے، ٹھڈے اگلے وقتوں کی یاد دلا رہے ہیں، لیکن آرہا ہے، وہ وقت کہ خزاں کے ظالم جھونکے سے یہ چراغ سحری بھی ہمیشہ کو گل ہو جائیں۔

بھائیو! میری آنکھ سے دیکھنا، اور داد دینا چل چلاؤ کا بازار ہے، دیکھنے دکھانے کے قابل کڑیل جوان، جن پر دلّی ناز کرتی تھی دلّی کی خاک میں جا چھپے! اگلی صحبتیں، کہانیاں اور پُرانے جھگڑے خواب و خیال ہو گئے مگر چشم تحقیق بازار

حُسن میں اب بھی کبھی کبھی وہ مہ جبین دیکھ لیتی ہے، جن کی ہر ادا، دل چھین رہی ہے۔

لو عزیزو آنکھ اٹھاؤ، اور اس مجلس پر نظر ڈالو، کیسے کیسے، باکمال، جمع ہیں ان کی چوگوشی ٹوپیاں اور سفید ڈاڑھیاں، ان کی سادگی پر قربان ہو رہی ہیں یہ کھُرّی چارپائی پر بیٹھنے والے، ظاہری خاک نشین، اور حقیقی عرش نشین ہیں، ان کے پہلو میں وہ دل ہیں جو دوسروں کے درد پر لہو بن کر ٹپکیں، اور بیمار بن کر تڑپیں، نواب تجمل رسول خان کا دیوان خانہ ہے، شام ہو چکی ہے۔ بنیئے کی دُکان پر آٹھ آٹھ نو نو برس کے لڑکے لڑکیاں ٹوٹی ہوئی بوتلیں میلے کچیلے کپڑے، مٹی کی پیالیاں لئے کھڑے ہیں مگر ہمدردی کی آنکھ ان بھولے بھالے چہروں میں افلاس کا پتہ لگاتی ہوئی اس مقام پر پہونچتی ہے۔ جہاں خدا کے سوا کوئی نظر نہیں آتا، پیارو! یہ اُن ماؤں کے لال ہیں جن کے سروں سے وارث اُٹھ گئے اور ان باپوں کے بچے ہیں جو اپاہج و بیمار گھروں میں پڑے ہیں، اُن کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اور پھٹے پرانے کپڑے چشم بصیرت کو عجب عجب رنگ دکھا رہے ہیں۔ یہ بیکس بیبیاں، بچوں کو کلیجے سے لگائے، پسائی اور سلائی پر گذر کر رہی ہیں، غربت نے، ان کے چاند سے چہرے خاک میں ملا دئے، مگر عصمت کی بیش بہا چادریں، ان کے شانوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ زمانے نے ان کو قلاش بنا دیا، لیکن ان کے صبر اور وضع داری پر اللہ ماف کے فرشتے درود پڑھ رہے ہیں، انسانیت ان کے مصائب پر خون روتی ہے ہمدردی کے ہاتھ ان بیبیوں کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، رونا اس کا ہے

کہ عفت کی ان تصویروں کی قدموں پر، آنکھیں بچھانے والے لوگ، اب دکھائی نہیں دیتے۔ وہی نواب صاحب کا دیوان خانہ ہے، اور چوگوشی ٹوپیوں والے بزرگ، ذرا ان کی باتیں سُنئے، اور مزے لیجیے،

"میاں آئی! ظہر کی نماز پڑھ کر نکلا تو چار جگہ پیسہ پیسہ کا گوشت لیا حکیم جی کی بیوی نے وال کا پیسہ بھیج دیا تھا وہ لی۔ سلیم کے ہاں کا باجرا لایا۔ محمود کی اماں نے جوار کا آٹا کھد یا تھا خانم کے بازار سے وہ چلا وہیں عصر پڑھی، لوٹنیوں کو دھیان آیا کہ شبّو کی اماں کئی دن سے دیوٹ کو کہہ رہی ہیں۔ چوک چلا گیا شام آن پہونچی تھی بھاگم بھاگ آیا اور مارا مار ایک ایک کے سودے دے، بیچاری حسینی کا آبخورہ پھر بھی رہ گیا، اب مغرب پڑھ کر وہ لایا"۔

نواب بتجمل رسول، میر صاحب کے ہاں کی بھی خبر لی، کچھ پکا یا نہیں"۔

میر ظریف" وہاں تو صبح کو بھی اللہ ہی کا نام تھا، بارہ بجے مجھے خبر ہوئی روٹی بچی نہ تھی، آٹا گندھوا اُسی وقت تندور سے پکوا کر لایا اور پہونچائی۔ اس وقت کی خبر نہیں چراغ تو میں نے دکھوایا تھا جل رہا تھا"۔

نواب صاحب "بس تو بھائی کھانا تیار ہے لو جاؤ دے آؤ، اور حسینی کے ہاں کی خبر لیتے آنا"۔

کہاں چلے گئے تم؟ اے انسان کی صورت میں فرشتوں۔ آج ہمدردی کی دُنیا تمہارے بغیر سُنسان پڑی ہوئی ہے، عصمت کی دیویاں اندھیروں میں راتیں، اور فاقوں میں دن کاٹ رہی ہیں، اور کوئی اتنا نہیں کہ ان کی حالت پر دو آنسو بہالے، خود غرضی کے ہوا چاروں طرف چل پڑی، اور عالم حیات کا ہر ذی ہوش انسان ترقی کی امیدوں میں مدہوش ہے۔

ہوا، تمہارے قدموں کی خاک تک اُڑا لے گئی، اور اب تمہارے خیال کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں، جو مجھ جیسے دیوانے، سر آنکھوں پر رکھیں۔ بزرگو! تم فرشتۂ رحمت تھے، کہ اپنی بہار کا جلوہ دکھا کر ایک عالم کو دنگ کر دیا۔ تمہاری زندگی کے خوشبودار پھول، جو قیامت تک، مہکیں گے، دُنیائے فانی کے چمنستان میں، بے نظیر تھے اور رہیں گے... خیال، تمہاری یاد سے مفارقت نہیں کرتا۔ مگر سپیدۂ سحر قریب ہے، رات ختم ہوئی۔ رخصت ہوا اور عالم ممات میں زندگی کے وہ مزے لوٹو جو زندوں کو مر کر بھی نصیب نہ ہوں گے۔

تمدن ۱۹۱۳ء

بھکارن شہزادی

پچاس سال سے بھی زیادہ ہی گذرے ہوں گے کہ دہلی کے اس محلہ میں جواب "بتاشوں کی گلی" کہلاتی ہے، بنیا کی ٹال کے پاس، گلی میں ہر جمعہ کی شام کو ایک بڑی بی برقع اُوڑھے ایک ہاتھ باہر نکالے کھڑی ہوتی تھیں، باوجود سخت کوشش کے وہ کبھی کسی گھر میں نہ گئیں، اور نہ کبھی کسی سے سوال کیا، ان کا نکلا ہوا ہاتھ ہی ان کی صدا تھا، اور مصیبت کا پتہ دے رہا تھا، محلہ والے جان گئے تھے، کہ یہ فقیرنی جس کا ہاتھ مسلمانوں کی بھیک کے واسطے وقت نے باہر نکالا شہزادی ہے۔ اور یہ بچی جو اندھی فقیرنی کی لکڑی پکڑے کھڑی ہے، بڑی بی کی نواسی ہے۔ محلہ والوں نے کئی مرتبہ خواہش کی، کہ وہ گھر میں چلیں مگر اُنھوں نے کبھی اس کو منظور نہ کیا، اس واسطے محلہ والے حسب حیثیت ان کو اتنا دے دیا کرتے تھے کہ آٹھ دن کو کافی ہو جائے نابینا بڑی بی کا نام (حسن آرا بیگم ثانی) کریم میں مرزا شیشہ والے کے گھر کے پاس ڈیڑھ روپیہ ماہوار کرایہ کے مکان میں رہتی تھیں، دو جوان لڑکیاں تھیں، مگر دونوں بیوہ۔ جن کے پانچ بچے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ

غریب، اور مصیبت زدہ مسلمان عورتوں کے واسطے دنیا تنگ اور زندگی تنگ نہ تھی صدری اور ٹوپیاں کلابتون سے کاڑھی جاتی تھیں، یہ ملکیت تو ہندو دوکان داروں کی ہوتی تھیں۔ اور اصل نفع وہی لیتے تھے۔ مگر ان بیچاریوں کو بھی مزدوری اتنی مل جاتی تھی کہ پیٹ پال لیں، بڑی لڑکی کی آنکھیں دُکھنے آئیں، اور ایسی دکھیں کہ جاتی رہیں۔ مگر سکھ نصیب نہ ہوا۔ اب صرف ایک لڑکی کی کمائی اور سارا گھر۔ غدر ۱۸۵۷ء کو پندرہ بیس برس سے زیادہ نہ ہوئے تھے، جنس سستی تھی، اور آٹا تیس سیر سے کم نہ تھا مگر دن بھر کی مزدوری صدری ٹوپیوں میں دو ڈھائی آنے اور گوٹہ میں تین آنے کی ہوتی تھی، آدمی زیادہ تھے اور سب کھاتا دھن، مجبور بڑی بی کو جو بادشاہ کی قریبی عزیز تھیں بڑھاپے میں برقع سر پر ڈالنا پڑا اندھی تھیں، اس لئے نواسی لکڑی پکڑ لیتی تھی، لیکن اب بھی اتنی سنجیدہ اور غیور تھیں کہ نہ سوال کرتی تھیں نہ کہیں جاتی تھیں۔ احمدی بیگم کا مجسمہ انقلاب کی پوری تصویر تھی، جو ہر جمعہ کی شام کو محلہ کی آنکھیں دیکھتی تھیں۔ قدرت ان کا نمونہ دکھا کر اپنے اصول دُہراتی تھی، اور زمانہ مسلمانوں کو آٹھویں دن اس بد قسمت عورت کی صورت میں ایک معقول درس دیتا تھا۔

چندی راج کا بیان تھا کہ احمدی بیگم کو میری ماں محمودی نے ڈبویا، وہ اس خاندان کی پرانی نمک خوار تھی، اور سب اس کو دَدا دَدا کہتے تھے۔

احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آئے بڑے وبدے کے آدمی تھے، ان کی سرکار بنی ہوئی تھی بیسیوں آدمی اُن کے دستر خوان پر بیٹھتے تھے، دروازہ پر نالکی پالکی موجود تھی جب مرزا مارے گئے اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم یعنی احمدی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے کا ارادہ کیا، دو پتیلیاں زیور سے بھریں، ہزاروں کا مال تھا۔ میری ماں نے اپنی چاندی کی پہنچیاں بھی اس میں رکھیں۔ شہر کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی، عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں نکل کھڑی ہوئیں، میری ماں نہ گئی، مگر روز دوپہر کو اپنی پہونچیوں کے واسطے ایک پھیرا مکان کا کر لیتی تھی۔ جب امی جمی ہو گئی اور ڈر جاتا رہا تو اللہ کی بندی نے شام بھی نہ ہونے دی، اور ایک دست پناہ لے کر کھودنا شروع کیا، آنے جانے والے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے یہ خبر گوروں کو بھی ہوئی، اور کھدائی شروع ہوئی تو دونوں پتیلیاں موجود تھیں۔ وہ لے گئے، اور دادا کی پہونچیاں بھی گئیں۔ بڑی بیگم واپس آئیں تو خاک بھی نہ تھا۔"

احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا، اُنھوں نے سو برس کے قریب عمر پائی، آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں اور بہت سخت تکلیفیں اُٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی، کہ کفن بھی دقت سے میسّر ہوا۔

فالج نے بالکل بے کار کر دیا تھا۔ چل پھر نہ سکتی تھیں، اور کئی دموں کا گذارہ

ایک دم کی محنت پر تھا۔ میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہو گی، کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا کہ دے آؤ۔ میں گیا، اور مرزا شیشہ والے کے گھر پر جا کر جو بندریا والے مشہور تھے، اس لئے کہ اُن کے ہاں بندریا پلی ہوئی تھی ان کا گھر پوچھا اس وقت تو خیال بھی نہ ہوا۔ مگر آج جب دھیان آیا ہے، تو اس گھر اور گھر والوں کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ شہزادی کے گھر میں کھانے کے واسطے مٹی کے ٹوٹے برتن تھے! اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی یہ اولاد دبکی اور سکڑی بیٹھی تھی۔

احمدی بیگم، اس روپیہ کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں، اور جو دعائیں اِن کے دِل سے نکلیں، ان کا اظہار مشکل ہے۔ اس وقت ہنستا ہوا گیا، اور ہنستا ہوا آیا۔ مگر آج جب احمدی بیگم کی اس جھلنگا چارپائی اور مصیبت کا خیال آتا ہے۔ تو تڑپ جاتا ہوں!

عصمت ۲۶ء

گلہری والی شہزادی

دریائے جمنا کے کنارے پر بیلہ کے گھنے جنگل میں جو اب کٹ کٹا کر صاف ہو چکا ہے، اور جہاں کئی ایک سڑکیں نکل آئی ہیں، مختلف مقامات پر کچھ قبریں بھی تھیں خدا معلوم وہ اب ہیں یا نہیں ہیں۔ بیلہ سے بچ کر فصیل کی جڑ میں، قلعۂ معلی کے بالکل سامنے، اور بہت قریب ایک مزار ہے جو شاہ بڑے کے نام سے مشہور رہا ہے۔ شہر کے سیلانی چھوڑے اب بھی شاید ہر جمعہ کو وہاں کبڈی کھیلتے ہیں۔ اور سیکڑوں آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ یہ جگہ غدر کے بعد سے ایک قسم کا تکیہ بنالی گئی ہے، جہاں شام کے وقت اب بھی لوگ باگ جمع ہو کر چنڈو، چرس وغیرہ کے دم لگاتے ہیں۔ مزار کے قریب ہی ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے۔ جہاں نماز بھی ہوتی ہے۔ یہ چبوترہ بھی غالباً مزار ہی سے متعلق ہے اور مسجد کی صورت میں ہے۔

غدر ۵۷ء کے شاید پچیس سال بعد شہزادوں کا مجمع کچھ جمعرات ہی پر موقوف نہیں روز شام کو یہاں ہوتا تھا، اور گپ شپ کے علاوہ مدک کے دم اور چنڈو کے چھینٹے بھی اُڑتے تھے جمعرات کے روز کچھ خوش

اعتقاد لوگ بھی اس مزار پر آجاتے تھے، اور اپنی منتیں مرادیں مانگا کرتے تھے۔ انھیں لوگوں میں ایک بڑھیا بی بی ہوتی تھیں جو "گلہری والی شہزادی" کہلاتی تھیں، ان کے پاس چار پانچ گلہریاں ہوتی تھیں، اور دوپہر کی توپ چلتے ہی یہ کچھ روٹی کے ٹکڑے کچھ چنے، اور کچھ چنے کی دال لے کر وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ وہاں پہنچتے ہی وہ گلہریوں کو چھوڑ دیتی تھیں، اور دو کنڈالیوں میں جو وہیں موجود رہتی تھیں ٹکڑے، اور چنے بھگو دیتی تھیں، اور آؤ آؤ کی آواز لگاتی تھیں۔ ان کی آواز پر بیسیوں گلہریاں آ کر جمع ہوتی تھیں، اور چنے اور ٹکڑے کھایا کرتی تھیں، یہ مغلیہ خاندان کی ایک باعزت خاتون تھیں، جن کو وقت نے تاراج و برباد کر دیا تھا، کبھی جی میں آجاتی تھی تو قلعہ معلّٰی کی شان و شوکت کا ذکر اور پرانی باتیں اس درد سے بیان کرتی تھیں، کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

میرے مکرم دوست شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی۔ بی۔ اے بیان کرتے تھے۔ کہ ایک موقع پر جمعرات ہی کے روز میں بھی بیلہ کی طرف سے آرہا تھا۔ گلہری والی شہزادی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا دیر تک باتیں کرتی رہیں، ان کی زبان اس قدر شیریں، اور سلیس تھی، کہ میں جب تک بیٹھا، مجھے ان کی باتوں میں ایک خاص لطف آتا رہا۔ ایک موقع پر ان کی مسلسل عبارت نے مجھ کو وہ مزا دیا، کہ جب تک زندہ ہوں بھول نہیں سکتا۔ فرمانے لگیں کہ۔

"جہاں نال گڑا تھا، آج وہاں قدم دھرنے کا حکم نہیں، میری پیدائش

اس لال قلعہ کی ہے۔ بچپن اسی خاک سے لتھڑ پتھڑ کے گنوایا جوانی انہیں درختوں کی چھاؤں میں بیتی، یہ پیپل کا درخت جس کی اس وقت پھننگیں دکھائی دے رہی ہیں۔ برسات کے دنوں میں نکھر نکھرا کر دلہن بن جاتا تھا، دُھلے دُھلائے پتے ہری بھری ٹہنیاں آنکھوں میں کھپتی تھیں منجھلی بیگم کا جھولا اس میں پڑتا تھا۔ کڑھائیوں کی قطار ہوتی تھی، ہلکی ہلکی پھوار۔ گرم گرم گلگلے پھلکیاں۔ وہ جھول رہی ہیں وہ جھلا رہی ہیں۔ ریشمی رسیاں گنگا جمنی پٹریاں۔ بھنبیری آوازیں"۔

اللہ اللہ کیا تھا کیا ہوگیا!

عصمت ۔ سنہ ۱۹۲۶ء

مچھیرن شہزادی

مچھلی کی منڈی میں مچھیرے اپنے اپنے بوجھوں کی بولیاں بول رہے تھے ٹھیکہ دار خوش تھا کہ باہر کا مال نہ آنے سے شہر کے دام چڑھ گئے۔ ایک چار ہی دن میں چھ سات آنے سیر کی مچھلی روپے چودہ آنے پر پہونچ گئی۔ بیکار سیدھے منھ بات ہی نہ کرتے تھے، اور اپنے اپنے مال کو سونا چاندی سمجھ رہے تھے۔ مال کا بڑا حصہ بک چکا، اور چھنا چھن روپیہ برس گیا تو کونہ میں سے ایک عورت جس کی گود میں بچہ تھا، اپنی تین مچھلیاں لے کر آگے بڑھی اس کے سر پر ایک میلی کچیلی چادر پڑی ہوئی تھی۔ مگر انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ پردہ کرنی اور منہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے، ٹھیکہ دار نے کہا۔

"اری بتا کیا مانگتی ہے؟"

عورت۔ "جس طرح سب کا مول ہو رہا ہے ان کا بھی مول کر لیجئے"۔ یہ جواب عورت نے دیا تو سہی مگر رُک رُک کر اور چپکے چپکے معلوم ایسا ہوتا تھا تھا، کہ وہ پریشان ہے۔ اور اس کو اس طرح گفتگو کرنے کا اتفاق کم ہوا ہے۔ ٹھیکہ دار نے کہا۔

اول تو تیری دو مچھلیاں جو پڑی ہیں موہ ہیں، کانٹوں کی پوٹ۔ ان کا گاہک کون ہوگا، دوسرے یہ بجھی ہوئی ہیں، شاید پرسوں کی پکڑی ہوں گی۔"

ٹھیکیدار کا یہ جواب سُنکر بیکاروں نے دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر اس نے ڈانٹ دیا، اور کہا "صبح سے اتنا مال بکا ہے اور ابھی پیٹ نہیں بھرا ہے"۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا صرف اتنا کہا "جو کچھ ہے یہ ہے"، ٹھیکیدار نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "جا اودھر بیٹھ جا، یہ مال ختم ہو جائے تو تجھ سے بات کروں۔"

سلو بیکار نے بھی دیکھ لیا، کہ دو ڈھائی روپے کا مال ٹھیکہ دار مفت میں آپ اڑا ئیگا اور کچھ پیسے ہاتھ پر رکھ دے گا جب بھیڑ چھٹ گئی، تو ٹھیکہ دار نے کہا "لے بیچار آنے لے جا اس کا گاہک ہی کون ہوگا۔ کانٹے ہی کانٹے ہیں۔"

عورت:۔ "اس سے آدھی آدھی مچھلی تو روپے روپے ڈیڑھ ڈیڑھ روپے بکی، اور یہ چار آنے کی۔"

ٹھیکیدار:۔ "بک بک نہیں کرتے مفت کی چونّی دے رہا ہوں۔ باہر نکل کر تو دیکھ کوئی چار پیسے بھی نہیں دے گا۔ میں نے تو رحم کھا کر اس بچہ کے واسطے دے دی چل باہر نکل"،

عورت:۔ "میں نہیں بیچتی۔ تم میرا مال دے دو۔" اتنے میں اور لوگ چلے گئے تھے۔ اور اب گنتی کے دو چار آدمی رہ گئے تھے، ٹھیکہ دار نے آگے بڑھ کر غصہ سے کہا "نکل باہر ایک تو نیکی کرو اوپر سے یہ بدلہ ملے، باہر جا۔"

عورت:۔ "میرا مال دے دو میں نہیں بیچتی"

ٹھیکیدار:۔ "چل چل باہر چل۔ مال دے دو کی بچی۔ اری مفت کی پاولی

مل رہی ہے، اور کیا یہ مکان لے گی۔"

عورت:۔"تو آپ میرا مال دے دیجیے۔"

ٹھیکیدار:۔"اور یہاں زمین پر رکھنے کی تہ بازاری کون دے گا؟ لا چار پیسے اور اپنا مال لے جا۔"

عورت:۔"بس تو مجھے چونی بھی نہیں چاہیئے خدا کے ہاں لوں گی"۔

ٹھیکیدار:۔"چل چل دور ہو خدا کے ہاں سے لیجو"۔ عورت روتی ہوئی چلی تو سلو پیکار بھی پیچھے پیچھے ہو لیا، اور پاس جا کر کہا "نیک بخت تو ہے کون؟"

عورت:۔"میں سلطان کی بیوی ہوں، وہ آج بیس دن سے موتی جھرے میں پڑا ہوا ہے۔ اب اتنا بھی نہیں کہ دو قدم چل سکے، تین آنے روز کا نسخہ کہاں سے لاؤں۔ دو بچے ایک میں۔ چار روپے سرکار سے ملتے ہیں۔ باقی یہ مچھلی کا سہارا تھا، کہ دس بارہ روپے وہ اس میں لے آتا تھا۔ پرسوں جب ایک پیسہ بھی پاس نہ رہا اور بیمار کو دوا تک نصیب نہ ہوئی، تو میں خود ڈور کانٹا لے کر دریا پر چلی گئی وہاں سے کچھ مل گیا میں سمجھی تھی آٹھ دس دن کو دوا ہی سے چھوٹوں گی، مگر تقدیر نے یہ گل کھلایا۔"

سلو۔ اری تو بھائی سلطان کی بیوی ہے، وہ جو شہزادہ ہے۔ قاضی کے حوض والا۔

عورت۔"ہاں"۔

سلو۔"لے تو مجھ سے یہ تین آنے لے جا۔ اور تو اس کا نسخہ لیتی جا۔"

عورت:"نہیں جو کچھ میرے ساتھ ہوا ٹھیک ہوا، میں نے جیسا کیا

اس کا پھل مجھ کو مل گیا۔

میری عمر کوئی دس برس کی ہوگی، کہ ہمارے ہاں قلعہ میں ایک دفعہ مچھیرن دو ٹوکرے مچھلیوں کے لے کر آئی دونوں بھرے ہوئے تھے ایک آنہ سیر بیچ رہی تھی۔ میں نے دو مچھلیاں چھپالیں، اس نے بھی دیکھ لیا بہتیرا ہی سر پٹخا۔ بڑی بیگم سے شکایت کی صاحب عالم کو خبر پہونچی میری بھی بلاؤ ہوئی، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اور یہ ہی کہتی رہی کہ جھوٹی ہے۔ وہ روتی ہوئی چلی گئی، اور ہم نے دونوں مچھلیاں خوب مزے سے کھائیں۔ آج جب ٹھیکہ دار نے مجھے باتیں سنائیں، تو وہ وقت یاد آگیا، بھائی یہ تو لینے کا دینا ہے، جیسا میں نے کیا ویسا پایا، مچھیرن بھی تو میرے ہاں سے روتی ہوئی نکلی تھی، اگر آج میں رو رہی ہوں تو کیا اچنبا ہے۔"

عصمت ۱۹۳۲ء

جھولے کی یاد

گرمی اس غضب کی پڑ رہی تھی۔ کہ آدھی رات تک دو منزلوں اور سہ منزلوں پر پنکھا ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ اور زمین سے شعلے نکل رہے تھے۔ خدا خدا کرکے کہیں پچھلے پہر ذرا ہوا سرسرائی تو آنکھ لگی۔ مگر کیا خاک لگی؟ اِدھر جھپکی آئی۔ اُدھر مُرغ کی ککڑوں کوں شروع ہوئی۔ پَو پھٹتے ہی کم بخت مکھیوں کی یورش ہونے لگی۔ غرض ساری رات اسی میں گزر گئی۔ بہتیرے ہی جتن کئے۔ کہ گھنٹے آدھ ہی گھنٹے کو سو رہوں۔ لیکن کروٹیں ہی بدلتے بدلتے خاصی اچھی صبح ہو گئی۔ اور لُو کا ایسا جھونکا آیا۔ جس نے سر سے پاؤں تک جھلسا دیا ساون کا مہینہ تھا۔ کوئل اور رموتیا چہک اور مہک رہی تھی۔ مگر گرمی نے کچھ ایسی دم پر بنا رکھی تھی۔ کہ جان ست ہی ست پر تھی۔ ٹھنڈے پانی کے کئی ایک تیترڑے غسل خانے میں سر پر ڈال باہر نکلی۔ تو کیا دیکھتی ہوں۔ پورب کی طرف سے سیاہ گھٹا اُٹھ رہی ہے۔ آناً فاناً سارا آسمان کالا بھنور ہو گیا۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ دل باغ باغ ہوا۔ ابر بھی کچھ ایسا گھِر کر آیا۔ کہ میں بے ساختہ بول اُٹھی۔ کہ برس گیا تو چھاجوں ہی ہے۔

مینہ برسنا شروع ہوا۔ اور ایسا دھائیں دھائیں۔ کہ شام تک کھلنے کا نام نہ لیا۔ میں سائبان میں چپکی پڑی تھی۔ لڑکیاں بالیاں پکانے ریندھنے میں لگی تھیں۔ کہ آپا بستی بھیگتی بھاگتی آپہنچیں۔ اور کہنے لگیں "شمسہ بڑھاپے میں جوانی یاد آرہی ہے۔ برابر کی سہیلیاں بھتیلیاں اکیلا چھوڑ سیدھی ہولیں۔ جی بہت گھبرایا۔ تو تیرے پاس نکل آئی۔ کہ چلوں کچھ شمسہ ہی سے مغز ماروں"۔

بستی اور میں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے ہمارا لڑکپن غدر سے پانچ سات سال بعد کا ہے۔ اب وہ اور میں نانی دادی بن گئے۔ بلکہ وہ تو پرنانی بن گئی۔ کہ نواسی کے ہاں بھی لڑکی ہوگئی۔ بستی کی صورت دیکھ کر کیا بتاؤں کیسی خوشی ہوئی۔ دل کا کنول ہرا ہوگیا۔ کوئی چھ برس بعد دیکھا تھا۔ آواز سنتے ہی جان میں جان آگئی۔ وہ بھی دوڑ کر لپٹ گئی۔ بہو بیٹیاں ٹھٹھے اڑا رہی تھیں۔ کہ دیکھو بڑھیوں کا کیا سہاگ ہو رہا ہے مگر ہم نے پرواہ نہ کی۔ مینہ تھم چکا تھا۔ اور پوروا فراٹے اڑا رہی تھی۔ ہم دونوں کوٹھے پر چلے گئے۔ تو بستی کہنے لگی:۔

"اندھیر ہے۔ رت بدلی۔ موسم بدلا۔ آدمی بدلے۔ مرد بدلے۔ عورتیں بدلیں۔ کچھ ایسی کایا پلٹی۔ کہ وہ رنگ ہی نہ رہا۔ ہم نے اس برسات میں کیسے کیسے مزے لوٹے ہیں۔ کہ آج ان کی یاد سے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ اب وہ سماں سننے میں بھی نہیں آتا۔ یہ ساون کی راتیں۔ محلہ ملہاروں سے گونج جاتا تھا۔ کون سا ایسا گھر ہوگا۔ جہاں کھم نہ گڑے ہوں۔ اور جھولا نہ پڑا ہو۔ شمسہ امرتوں کے جھمگھٹ یاد ہیں؟ آم کے درختوں میں لال سبز رسیاں پڑی ہیں گنگا جمنی پٹڑیاں ڈلی ہیں۔ اور کڑاہیاں چڑھ رہی ہیں۔ روے میدے کے گرم گرم پراٹھے تندور سے

آ رہے ہیں۔ اندھیری باغ کا ٹپکا۔ قند سے میٹھا۔ جہاں گیر کے باغ کی موٹی موٹی جامنیں کالی بھونرالی۔ وہ جھول رہی ہیں۔ چار جھلا رہی ہیں۔ وہ چہل پہل ہو رہی ہے۔ کہ جنگل میں منگل ہو گیا۔

"چھوٹی چچی جان کے جھولے میں تو بادشاہ بیگم بھی آئی تھیں۔ دو تین دن پہلے تیاریاں ہو گئیں تھیں۔ چچی جان بارہ تیرہ برس کی دُلہن تھیں۔ ایک دن اور رات کیا دھما چوکڑی مچائی ہے۔ کہ مالی تک چیخ اُٹھے بیگم صاحبہ نماز پڑھتے ہی آ گئی تھیں کھانے پینے کی ان کے ساتھ کمی نہ تھی۔ مگر کیسی جنّتی بیوی تھیں۔ کہ ہمارا دل نہ توڑا۔ اور اپنا کھانا چھوڑ چھاڑ ہمارے بیسنی پراٹھوں میں آ بیٹھیں۔ اے ہے شمسہ وہ دن ہَوا ہو گئے۔ وہ پراٹھے دیکھنے ہی میں نہیں آتے۔ رجب کے ہاتھ کا تسوند بن ہی نہیں سکتا۔ آم کا اچار سرکے کی میٹھی چٹنی اب بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ مزا نہیں۔ پھوپھی آمنہ نے کیا پھرتی کی ہے۔ کہ سب دنگ رہ گئے۔ ہم سب تو بیگم صاحبہ کے دیکھنے ہی میں رہے۔ اُنھوں نے جھٹ چولھا رکھ آگ سلگا کر کڑھائی چڑھائی گرم گرم شامی کباب۔ اُتار تر پھر بیگم صاحبہ کے سامنے رکھ دیئے۔

"ناشتہ کر پھسلنے پتھر پر آئے۔ پہلے بادشاہ بیگم پھسلیں۔ اُن کے بعد ہم سب پھسل پھسلا جھرنے پر پہنچے۔ زنانہ ٹکڑے میں کمر کمر پانی تھا۔ کیا کیا دھما دھم گدائی ہوئی ہے۔ کہ پانی بھی چیخ اُٹھا۔ نہا دہو کپڑے بدلے تو آموں کی جھلیاں اور جامنوں کے ٹوکرے موجود تھے۔ بیگم صاحبہ نے آم کا چھلکا ایک اردبیگنی پر پھینک دیا۔ پھر کیا تھا؟ وہ ہوئی ہے۔ کہ واہ وا+

یہ فیروزہ کا کم بخت جواب الگنی پر پڑ گئی۔ سدا ہی کی چنچل تھی۔ بڑی اردبیگنی کا

دوپٹہ چھپا دیا۔ وہ بھی سمجھ گئی۔ اب فیروزہ آگے آگے۔ اور وہ پیچھے پیچھے۔ بیگم صاحبہ کیسی ہنس مکھ تھیں۔ بڑھیوں میں بڑھیا۔ اور لڑکیوں میں لڑکی۔ ارد بیگنی سے کہتی کیا ہیں "اری تجھے یاد بھی ہے۔ دوپٹہ اوڑھ کر آئی تھی؟" مزہ یہ ہے کہ دوپٹہ سچ مچ ہی غائب ہو گیا۔ ادھر فیروزہ درختوں میں چھپا کر آئی۔ اُدھر مالن پہنچی۔ اور دوپٹے چلتی بنی۔ ارد بیگنی کھلے سر دوڑ لگے مارتی پھری۔ مگر دوپٹے کا پتہ نہ چلا۔ "دن اس طرح گزرا کہ بات کرتے میں دوپہر بج گئی۔ بھوک زور سے لگ رہی تھی۔ مگر بیگم صاحبہ جھولے میں جا بیٹھیں۔ اب جو پھوپھی حیدا ری لہکی ہیں۔ تو سناٹا چھا گیا۔ بہار اور پنہاری دونوں ملار اس مزے سے گائے۔ کہ جی خوش ہو گیا۔ عجیب لطف تھا۔ دو اُتریں دو چڑھیں۔ دو ہٹیں۔ دو بیٹھیں۔ ظہر کی نمازیں پڑھ کر کھانے بیٹھے۔ نام تو پکوان کا تھا۔ مگر ہمہ نعمت موجود تھی۔"

میں "اے ہے بسنتی۔ تو نے تو آج دل کھرچ لیا۔ بُوا۔ وہ تو خواب تھا۔ اب جھولے ہی نہیں رہے۔ کچھ ایسی ہوا بدلی۔ کہ وہ سماں درہم برہم ہو گیا۔ بڑی بوڑھیاں لڑائی میں کوسا کرتی تھیں۔ آہی ایسی آ کر پڑے۔ کہ سر کھجانے کی فرصت نہ ہو۔ وہ رنگ آج دُنیا پر چھا گیا ہے۔ جو ہے اپنی پڑی میں ایسا گرفتار کہ آنکھ اُٹھا کر دوسری طرف دیکھنے کی فرصت نہیں۔

سنہ ۱۹۲۸ء

بہادر شاہ کی بھانجی نند کے قدموں پر

آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک معاشرت انسانی کی مختلف صورتیں رہی ہیں جس طرح ہر ملک اور ہر قوم کی زبان میں آسمان زمین کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی معاشرت بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ یہ افتراق کچھ تعجب انگیز نہیں رونے یا ہنسنے کا وقت وہ ہوتا ہے۔ جب ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم وقت کے تحت میں حالات کے اعتبار سے ایسا چولا بدلے کہ سفیدی سیاہی نظر آنے لگے۔ اور سیاہی سفیدی۔

ہندوستان کی موجودہ اسلامی معاشرت کا مقابلہ اگر اس صدی کی ابتدائی حالت سے کیا جائے تو آسانی معلوم ہو جائے گا کہ نسوانی تمدن کس سرعت کے ساتھ کینچلی بدل رہا ہے، اور پرانی باتیں روز بروز مردود ہو رہی ہیں، اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے۔ کہ قدیم روایات کی حمایت میں منہ سے بھاپ نکالنی بھی گناہ عظیم ہے۔ یہی ہیں، وہ اسباب جو اب مجھ کو کچھ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اتفاق سے اسی ہفتہ میں مجھے ایک ڈپٹی صاحب کے ہاں شادی میں شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ میں ان چیزوں سے بھی اب بہت دور رہتا ہوں، لیکن مجبور ہو گیا اور صرف چند منٹ

کے واسطے چلا گیا۔ واپسی میں رفعت آرا بیگم کی شادی یاد آگئی۔ آج یہ کہنے کی ہمت نہیں ہے۔ کہ خوبیوں سے لبریز وہ شادی تھی یا یہ۔ جو دیکھا وہ لکھتا ہوں۔ فیصلہ پڑھنے والوں پر ہے۔

رفعت زمانی بیگم بادشاہ کی ماموں زاد بہن شمس زمانی بیگم کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد سلطان دولہا نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ یہ ۱۸۵۴ء کی باتیں ہیں۔ میری عمر آٹھ نو سال کی ہوگی۔ مہینہ میں ایک یا دو دفعہ میرے دادا مولوی عبد القادر صاحب مرحوم جو دونوں میاں بیوی کے استاد تھے ان کے پاس نظام الدین میں جہاں ان کی مستقل سکونت تھی جاتے رہتے تھے۔ میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ رفعت زمانی کی عمر جہاں تک مجھ کو یاد ہے تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ کبھی ہم ان کے ہاں گئے ہوں، اور دونوں میاں بیوی نے مولوی صاحب سے بچی کی شادی کے متعلق فکر نہ ظاہر کیا ہو۔ ایک سہم تھا، کہ دونوں کے سر پر سوار تھا۔ اور ان کا یہ کہنا یقیناً صحیح تھا، کہ رات کی نیند، اور دن کی بھوک اُڑ گئی تھی، اور رفعت کی شادی کے سوا ان کے سامنے کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ ان کے پاس مختلف حیثیت کے پیام تھے، اور ان ہی کو وہ مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی رائے اور سلطان دولہا کی رائے بھی بیان کر دیتی تھیں۔

میں یہ صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمدن موجودہ کا قدامت پر یہ زبردست حملہ ہے۔ کہ لڑکیاں شادی کے معنے سمجھنے سے قبل نکاح کے چولہے میں جھونک دی جاتی تھیں، یہ کہہ دینا کچھ مشکل نہیں ہے، مگر یہ غور کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ

ایسا کیوں ہوتا تھا، اس طویل بحث کی تہ میں جو چیز مجھ کو صاف نظر آتی ہے
وہ یہ ہے کہ وہ لوگ کواری لڑکی کو ایک بیش بہا جوہرا ور اپنے تئیں امین
سمجھتے تھے، اور اس جوہر کی قیمت ان کی نگاہ میں اس قدر تھی، کہ وہ اس کو
ہوا لگنے کے احتمال سے بھی محفوظ رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، میں اس پر
بحث کرنی نہیں چاہتا، کہ یہ احتیاط صحیح تھی یا غلط۔ مگر مطعون کرنے سے
پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے، خلاصہ یہ کہ محمد زمانی بیگم، کی خواہش
یہ تھی، کہ لڑکے میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ بدمزاج نہ ہو، جھوٹ
نہ بولتا ہو۔ اور زا سے روٹی کھلا سکے۔ انھوں نے برادری کا ایک اچھا
پیام صرف اس لیئے رد کر دیا۔ کہ لڑکا کبوتر باز تھا، حالانکہ سو روپے ماہوار
وظیفہ تھا۔ اور اڑتالیس روپے ماہوار کی آمدنی کو اس واسطے منظور
کرلیا، کہ لڑکا رحم دل نمازی، اور نیک تھا۔ مولوی صاحب بھی اس رائے
سے متفق ہو گئے، اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

مجھے جو خاص بات اِس وقت کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ جس شادی نے مجھے
یہ لکھنے پر آمادہ کیا اور جہاں میں کھانے پر مدعو تھا وہ وسیع پیمانہ پر تھی۔ اور
دستر خوان پر پچاس کے قریب مہمان تھے لیکن قریب قریب یہ سب غیر
تھے عزیزوں میں سے گنتی کے دو تین آدمی تھے صاحب خانہ کے حقیقی بھائی
جو مفلس تھے ان کے خاندان کا کوئی فرد مجھے نظر نہ آیا۔ ہاں دولھا میاں کے
ہم جماعت اور ان کے والد کے دوست کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ چونکہ
وہ معزز عہدہ دار ہیں اس لئے محفل ان ہی کے رنگ کی تھی۔ میں اسی شام کو

اتفاق سے ان کے بھائی سے ملا تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس رقعہ بھی نہیں گیا۔
یہ ۱۹۳۳ء کی شادی ہے جہاں غریب بھائی اس واسطے نہیں پوچھا گیا
کہ مفلس ہے! اُس کے بچے اس دسترخوان پر اور اُس کی بیوی اس مجلس
میں شریک ہونے کے قابل نہ تھی۔ رفعت زمانی بیگم کی شادی ۱۸۷۵ء
میں ہوئی، اور اٹھاون برس میں مسلمانوں کی معاشرت کہاں سے کہاں پہونچ
گئی! محمد زمانی بیگم کی حقیقی نند جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں سیتارام
کے بازار میں رہتی تھیں، ان کے شوہر آصف مرزا کو جو کچھ ملتا تھا۔ وہ
ان کے اخراجات کو کافی نہ تھا۔ بچے بہت سے تھے اس لئے مشکل سے گذر
ہوتی تھی ان کا بڑا لڑکا اعظم بھی جوان تھا دونوں باپ بیٹے دن رات مچھلی کے
شکار میں رہتے مارات کو آٹھ نو بجے گھر میں گھسے اور صبح نماز کے وقت دریا پر
جا پہونچے۔ کسی موقعہ پر دونوں نند بھاوجوں کی لڑائی ہوئی اور اس لڑائی نے
ایسا طول کھینچا کہ ملنا جلنا، آنا جانا سب بند ہو گیا۔ سلطان دولھا بھی کبھی بہن کے
ہاں نہ جاتے۔ اس موقعہ پر جب رفعت کی تاریخ مقرر ہو گئی تو ایک روز
مولوی صاحب نے محمد زمانی بیگم سے کہا کہ "یہ تو کہیئے کہ نند کو بلاوا
دینے کون جائے گا؟"

محمد زمانی:۔ "جس کو آپ فرمایئے۔"

مولوی صاحب:۔ "تم کو خود جانا چاہیے۔"

محمد زمانی:۔ "مجھے ان کے ہاں گئے دو سال ہو گئے وہ بھی اس عرصہ میں
نہ خود آئیں، نہ اُن کا کوئی بچہ آیا۔ سنتی ہوں کہ انہوں نے قسم کھالی ہے اور

بچہ" کو وصیت کر دی ہے کہ سلطان بھائی کو میرے جنازہ پر بھی نہ آنے دیں"

مولوی صاحب :- "تو تمہارا ارادہ اب کیا ہے۔ کیا بغیر اُن کے لڑکی وداع کر دو گی"

محمل زمانی :- "میری تو یہ خواہش نہیں ہے اُنھوں نے بے خطا مجھے اور اپنے بھائی کو ہزاروں باتیں سُنائیں اور ملنا جُلنا چھوڑ دیا۔ میں نے عید پر حصہ بھیجا، عیدی بھیجی۔ سویاں بھیجیں لیکن اُنہوں نے سب واپس کر دیا۔ اور ہزاروں باتیں سُنا ڈالیں"

مجھے اب مولوی صاحب کے الفاظ یاد نہیں۔ البتہ اُن کا مفہوم ذہن میں ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں ادا کرتا ہوں۔

٭

میں مان لیتا ہوں کہ تمہارا بیان حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اور تم بے خطا ہو اور قصور سر تا سر تمہاری نند کا ہے۔ مگر تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ میں تم کو مسلمان سمجھوں" اور اس کے بعد تم سے ان تمام حقوق کی ادائیگی کا متوقع ہوں جو اسلام نے تم پر عاید کئے۔ تم کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آصف دُلہن اور سلطان دولہا ایک ہی گھر میں پلے اور بڑھے ان دونوں نے ایک ہی مرنے والی کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے۔ اور ایک ہی عورت کے دودھ اور گود سے پروان چڑھے، کیا اس ماں کے دودھ کا یہی حق ہے۔ کہ سلطان دولھا اس خوشی کے موقعہ پر جب خدا اسے بہتر و برتر ان کو ایک اتنے بڑے فکر سے سبکدوش کر رہا ہے حقیقی بہن کو جو مرحوم باپ اور مغفور ماں کی نشانی اور

یادگار ہے۔ اپنے گھر پر بھی نہ آنے دیں اور تمہارے دسترخوان پر جہاں مجھ جیسے غیر، مکلّف کھانوں سے پیٹ بھریں ما جائی اور اس کے بچے قطعاً محروم رہیں۔ مجھلی خانم! یہ شادی اور اس کی مسرتیں فانی ہیں۔ مگر اس کے اثرات باقی رہیں گے، اور اس سے بڑا سنگین واقعہ تمہاری یہ حرکت ہوگی کہ تم سلطان دولہا کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کے عزیزوں کو اس بری طرح دھتکارو کہ ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ ہو۔

میرا خیال اگر غلط نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو تمہارے بیسیوں عزیز امیر اور غریب رفعت کی شادی میں شریک ہوں گے۔ مگر کیا سلطان دولہا جس کا ایک بہن کے سوا کوئی عزیز زندہ نہیں اتنا حق بھی نہیں رکھتا کہ اس کی بہن اور بچے اس خوشی میں شریک ہوں۔

تم کو اسلام کی یہ تعلیم یاد ہوگی کہ کسی مسلمان کو روا نہیں کہ دوسرے مسلمان کی طرف سے تین دن سے زیادہ اپنے دل میں کدورت رکھے۔ اگر آصف دلہن اس گناہ کی مرتکب ہوئی تو کیا ضرور ہے کہ تم بھی شریک گناہ ہو۔ تم محض خدا کے واسطے جس نے تم کو یہ مبارک گھڑی دکھائی نفس کو زیر کرو۔ خودی کو مٹا دو۔ اور گردن نیچی کرلو، دنیا تمہاری تعریف کرے گی، اور خدا تم سے خوش ہوگا۔ اور جب تم نند کے غصے اور فضیحتی پر بھی ان سے شرکت کی التجا کروگی تو وہی نفس جو بھڑک کر آگ لگائے گا کسی نہ کسی وقت تمہارے کان میں مرحبا کہے گا۔ اور تم کو وہ خوشی نصیب ہوگی جو رفعت کی شادی سے زیادہ پائدار ہے۔

مولوی صاحب کی تقریر سے۔ مجھلی خانم بیگم اور سلطان دولہا اس قدر

متاثر ہوئے کہ دونوں میاں بیوی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں بھی ساتھ تھے۔ بچی کی شادی کا نام سُنتے ہی آصف دُلہن اُچھل پڑیں۔ بھاوج کے گلے میں باہیں ڈال دیں، اور لپٹ کر رونے لگیں۔ محمد زمانی بیگم نہایت رقیق القلب عورت تھیں۔ نند کا یہ طرزِ عمل اس قدر موثر تھا۔ کہ اُنھوں نے فوراً بھاوج کے قدم پکڑ لئے۔ اور دونو نند بھاوجیں دیر تک روتی رہیں سلطان دولہا نے دونوں کو الگ کیا، اور پانی پلایا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اور آصف دُلہن شوہر اور بچوں سمیت نظام الدین گئیں۔

رافعت کی شادی کا یہ واقعہ لکھنے کے بعد اب میں اپنے معزز دوست ڈپٹی صاحب سے جن کے ہاں میں شادی میں شریک ہوا۔ اس قدر عرض کروں گا کہ وہ غور فرمائیں۔ اور سوچیں کہ اس سنوں کھانے میں غریب بھائی اور بھاوج شرکت سے کیوں محروم کئے گئے۔ کیا یہ بھائی اس گود کا بچہ نہیں ہے جس میں آپ نے پرورش پائی۔ اور کیا آپ کی بیگم صاحبہ جو میری ہی ہم عمر ہیں یہ یاد فرمالیں گی کہ مرنے والے بہو کو ہزار برس کی نیو کہتے تھے، کیا ڈپٹی صاحب کی والدہ ہزار برس کی نیو سے جس پر خاندانی عمارت تعمیر ہوگی یہ ہی توقع رکھتی تھیں کہ جس روز آپ کے نوکر بریانی متنجن سے پیٹ بھریں اس وقت آپ کے حقیقی بھائی اور اس کے بیوی بچے اپنے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں سوکھی روٹیاں کھائیں۔

عصمت ۱۹۳۳ء

تیراکن اماّ

جہان آباد میں غدر کے بعد کا ابتدائی دور ایسا گذرا ہے کہ آج بھی اس کے خیال سے کلیجہ تڑپ اُٹھتا ہے۔ وہ دن جب بے گور و کفن مُردے چاروں طرف بسسک رہے تھے ختم ہو چکے تھے اور وہ راتیں جب زندوں کے نالے مردوں کو تڑپا رہے تھے۔ گذر چکی تھیں مگر اب ان مصیبتوں کی یادگار ایک دوسرے رنگ میں قیامت بپا کر رہی تھی سونے چاندی میں کھیلنے والے ہاتھ دو دو دانوں کو محتاج تھے اور جن کے گھروں سے لنگر تقسیم ہوتے تھے ان کا پیٹ دوسروں کے رحم پر بھرتا تھا۔ آزردہ نے اس انقلاب کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

سنگ سینہ سے اُٹھایا تو سرہانے رکھّا
ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھّا

جس طرح آج کل مسلمان عورتیں رات کے وقت پارکوں یا اور دوسرے مقامات پر سیر و تفریح کے لئے نکل جاتی ہیں اسی طرح اس وقت مصیبت کی ماری فاقہ زدہ عورتوں کے جھلڑ عشار کی نماز کے بعد جامع مسجد پر اپنے

بچوں کے ہاتھ پکڑے چاروں طرف پھرتے بھیک مانگتے دُعائیں دیتے اور اپنی کیفیت سُنا کر پیٹ بھرتے۔ کھاری باؤلی والے صوبہ دار اشرف خان۔ دو من کی خمیری روٹی اور چنے کی دال کا بھرتہ نماز کے بعد تقسیم کرتے تھے ان کو دیکھ کر دوسرے ذی استطاعت مسلمان بھی ایسا کرتے تھے۔ اور اس طرح ان بدبختوں کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ ان میں بیسیوں اللہ کی بندیاں ایسی بھی تھیں جن کو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اس کے سوا کچھ میسر نہ آتا تھا خدا کی مخلوق میں جس طرح صورتوں کے اعتبار سے مختلف شکلیں ہوتی ہیں اسی طرح عادت وخصلت کے اعتبار سے بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں ہرے بھرے صاحب کے مزار کے پاس جہاں اب تو چوک کی وجہ سے میلہ لگا رہتا ہے۔ اس وقت آبادی زیادہ نہ تھی اور بہت کم آدمی ادھر نظر آتے تھے مزار کے دائیں طرف ایک بی بی سفید برقع میں ہمیشہ کھڑی دکھائی دیتی تھیں اُنھوں نے زبان سے سے کبھی سوال نہ کیا صرف ان کا ہاتھ برقع سے باہر ہوتا تھا۔ یہ تیرا کی کے اُستاد خلیفہ رحیم کی بیوی تھیں کسی زمانہ میں ان کا دور دورہ تھا اور پیرجی محمد عمر صاحب جو ان کے پڑوسی تھے ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ ان کے دسترخوان سے بیسیوں بھوکوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ وقت نے ان کو یہ دن دکھا دیا ان بی بی کی خاموشی اور ان کے حالات کا شہر بھر میں چرچا تھا اور سب ان کو تیرا کن اماں کہتے تھے پیرجی فرماتے تھے کہ ایسی قانع عورت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے یہ حقیقت بھی تھی اور میں اب بھی جب کبھی ان مٹی ہوئی صورتوں کا خیال کرتا ہوں تو اُجڑی ہوئی دلی کی تصویر آنکھوں کے سامنے

آجاتی ہے۔ میں اور میرے ساتھ اور بھی تین چار آدمی تھے رات ہوچکی تھی تیرا کن اماں نماز عشا پڑھ کر سڑک پر آکھڑی ہوئیں، اور برقع میں سے ہاتھ نکال دیا۔ مرحوم میرزا محمد اشرف گورگانی کے والد خلیفہ کے شاگرد تھے اسس لئے مرزا ان کو نانی کہتے تھے، ایک دُوانّی نکال کر مرزا نے ان کو دی۔ تیرا کن اماں نے بہت سی دعاؤں کے ساتھ وہ دوانّی واپس کردی اور کہا "میں اب پکانے ریندھنے کے قابل نہیں ہوں، آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ کوئی گھر نہیں، کوئی در نہیں، جہاں جگہ ملی پڑ رہی، ابھی پیٹ بھرنے کو دو روٹیوں کی ضرورت لگی ہوئی ہے۔ یہ مانگ لیتی ہوں، وہ رازق ہے پیٹ بھر دیتا ہے یہ دوانّی تمھارے زیادہ کام آئے گی رکھ لو"

مجھے اب بھی جب ان کے الفاظ یاد آتے ہیں تو ایک کیفیت طاری ہوجاتی ہے کیسی بااصول اور سیر چشم عورتیں تھیں جب مرزا نے زیادہ اصرار کیا تو دوانّی لے لی اور اس کو بُھنا کروہ پیسے بچوں کو تقسیم کر دئے۔

دلّی کی خاک سے جو باکمال پیدا ہوچکے مشکل ہے کہ زمانہ اب ایسی صورتیں دوبارہ دکھائے خدا اپنی رحمتوں کے پھول ان پر نازل کرے۔

عصمت ۱۹۳۴ء

اگلے لوگوں کی وضع داری

جہاں آباد کو دیکھنے والی صورتیں تو مٹی ہی تھیں، قلق یہ ہے کہ ان کو دیکھنے والی آنکھیں بھی بند ہو گئیں اور آج ان کے رونے والے مجھ جیسے دو چار مرثیہ خواں باقی ہیں۔

شہر آبادی کا سماں میں نے بھی نہیں دیکھا۔ ہاں ان مقدس چہروں کی زیارت کی ہے جن کے دل دلی کی آگ سے جھلس رہے تھے جن کی داستانیں صحبت شب کا سماں دکھا دیتی تھیں اور جن کی تانیں زخمی دلوں کے ٹکڑے اڑا رہی تھیں،

میں نے دلی کا وہ دور نہیں دیکھا جب چپے چپے اور کونے کونے میں گوہر یکتا چمک رہے تھے، ہاں چوک کے دو رویہ درخت جو جیٹھ بیساکھ کی گرمی کے تھکے ماندے مسافروں کو پناہ دیتے تھے، میری آنکھ کے سامنے ہیں،

سعادت خاں، اور مور سرا کی نہریں میرے سامنے بہتی ہیں۔ پن چکی کو برابر ہوتے میں نے دیکھا ہے۔ زینت محل کے کمرے کی پچھلی تصویر اب بھی میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بیلے کے سرسبز اشجار کھڑنک اور پہاڑ گنج کی عالیشان

عمارتیں میرے سامنے ڈھنڈار ہوئی ہیں۔ آج دلی عبارت ہے وئسرائگل لاج سے، اسر کورٹ ہاؤس سے۔ رائے سینا کی پختہ سڑکوں، اور خوشنما باغیچوں سے! اور جب سنتا ہوں کہ قطب تک عمارتیں ہی عمارتیں بن گئی ہیں جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ تو بے ساختہ کہتا ہوں کہ مکان بن گیا، مگر وہ مکیں کہاں!

تاجور صاحب! اپنے ان چند سطروں کی فرمائش سے مجھے تکلیف دی، بھائی دِلّی کیسی اور دلی والے کہاں؟ وہ صحبت ختم اور بزم درہم برہم ہوئی۔ اس خاک سے ایسے ایسے لوگ اُٹھے ہیں کہ وضع داری ان کے قدم چومتی تھی اور انسانیت ان کی زندگی پر قربان ہوتی تھی۔ بیس سال سے زیادہ ہی ہوئے ہوں گے، میں چاوڑی بازار میں مرزا جان رفوگر کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ اللہ مرزا صاحب کا خیال آتے ہی ان کی صورت آنکھوں پھر گئی۔ سرخ وسپید رنگ، بھری ہوئی ڈاڑھی گٹھا ہوا بدن۔ تن زیب کا انگرکھا۔ تنا ہوا جسم، بنے ہوئے ڈنٹر، شاگرد گھٹنوں پر شالیں ڈالے رفو کر رہے ہیں، اور مرزا صاحب خاموش بیٹھے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ کوئی دلی والا دکھائی دے گیا تو فرشی سلام اور پاس بلا کر دو چار باتیں کیں، زبان۔ سبحان اللہ! فصاحت کا دریا تھا کہ امنڈ تا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر ہو چکی تھی۔ مگر کسرت کا شوق باقی تھا۔ دونوں ڈنٹروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اور خوش ہو رہے ہیں مجھ سے فرمانے لگے۔

"آ کا روٹی نصیب نہیں۔ مگر اب بھی پانسو پیل لیتا ہوں" میں نے کہا۔ "مرزا صاحب! فرمائیے آج کل کیا شغل ہے" ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگے "ارے میاں کیا پوچھتے ہو، شہر اُجڑا۔ شہر والے اُجڑے۔ مولانا دیکھتے ہی دیکھتے بھرے گھر صاف ہو گئے، نواب علاؤالدین خان کی سرکار! حکیم محمود خان کا دربار، ظہیر الدین خان کی بیٹھک! ہائے مولانا کیا سبھائیں اُٹھیں ہیں۔ دل تڑپتا ہے۔ کیسے پائے کے لوگ تھے! اب اجڑے شہر کی نشانیاں یہ دو گھر رہ گئے ہیں۔ اجمل خان اور رضی الدین۔ مگر غضب دیکھو دونوں میں پھوٹ ہے! پھوٹی آنکھ کا دیدہ، دو ڈیوڑھیاں اور وہ بھی گائے کا گردہ! آ کا مشکل تو میری ہے میں نے محمود خان اور ظہیر الدین خان دونوں کے ہاتھ چومے ہیں اب اس منہ سے کس کو برا کہوں۔ گیارہ بجے تک اجمل خان کے ہاں بیٹھتا ہوں دو بجے تک رضی الدین خان کے ہاں بائیس برس سے اس حاضری میں فرق نہیں آیا۔ جو یہاں سنا وہ یہاں چھوڑا جو وہاں کان میں پڑی وہ وہاں پھینکی" مرزا صاحب نے اب پھر دونوں ڈنٹر دیکھے، اور فرمایا، "آ کا! دیکھو تو یہی لوہے کی سلاخیں ہیں۔ ایمان سے کہنا، آ کا اس بدن پر ریاضن کیا ہے ریاض!!"

شام ہو رہی ہے۔ سیلانی جیوڑے، رنگین چادرے بغل میں لئے پان کی گلوری منہ میں دبائے چاوڑی کی سیر کو نکل پڑتے ہیں۔ موتیا اور چنبیلی کی صداؤں سے بازار گونج رہا ہے، فٹنیں اور چوکڑیاں، پالکیاں اور گاڑیاں آ۔ اور جا

رہی ہیں۔ مرزا صاحب تن تن کر اور پھیل پھیل کر ڈنڈوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ہدایت پنواڑی کی دوکان پر جھمگھٹا لگا ہوا ہے، الائچی دار پانوں کی فرمائشیں ہو رہی ہیں۔ سامنے سے ایک گورا چٹا آدمی، شربتی کا چُست انگرکھا پہنے، آٹھ انگل لیس کی ٹوپی سر پر، وصلی کی جوتی پاؤں میں، سُرنگ گھوڑے پر خراماں خراماں چلا آرہا ہے۔ مرزا صاحب نے بھانپا اور کہنے لگے۔

"نواب احمد سعید خان آرہے ہیں" آ کا! ہو بہو علاؤ الدین خان کی تصویر ہے۔ عادت میں، خصلت میں، صورت میں، شکل میں۔ وضع میں قطع میں، بات میں، چیت میں، دوسرا علاؤ الدین خان سمجھ لو! آ کا اب ادہر بھی اللہ کا نام ہے۔ لو اب تم سیر دیکھو۔ نظر کے ساتھ ہاتھ اُٹھے گا، جنتی نواب کا بھی یہ ہی وطیرہ تھا۔ میاں یہ رنگ بھی ختم ہو رہا ہے"

وقت کی بات تھی یا مرزا صاحب کی تقدیر میں ندامت کہ نواب نیچی گردن کئے بغیر سلام کئے نکل گئے۔

اب مرزا صاحب کی عجیب کیفیت تھی گھبرا کر کہنے لگے۔

"مولانا خدا قسم! احمد سعید خان نے جس روز سے نکلنا شروع کیا ہے، آج تک بے سلام کئے آگے قدم نہیں اُٹھایا! آ کا بھول گیا۔ پیڑیوں کا نواب ہے۔ نام کو تمکنت نہیں، اچنبا ہے اچنبا۔ احمد سعید خان اور بے سلام کئے نکل جائے! عقل کام نہیں کرتی!" مرزا صاحب متحیر و متعجب سر دُھن رہے تھے کہ نواب کا گھوڑا لوٹا، اور چشم زدن میں احمد سعید خان ہاتھ باندھے

دوکان کے آگے کھڑے فرمارہے تھے۔" مرزا صاحب! معاف کیجیے گا اپنی دُھن میں چلا گیا"

سُبحان اللہ! سُبحان اللہ کیسا پُر لطف سماں ہے، نواب احمد سعید خاںؒ سلام نہ کرنے پر معمولی رفوگر سے معافی مانگ رہے ہیں! اور کس طرح؟ گھوڑے سے اُتر کر اور ہاتھ جوڑ کر!!

دلّی کی وضع داری کا یہ ادنیٰ سا نمونہ اور صحبت شب کی ہلکی سی جھلک تھی، اب یہ صحبت ختم ہوئی، اور جس سرزمین پر طائران خوش الحان کی چہک انسانیت کے نغمے سُنا رہی تھی وہاں "تھینکیو"[1] اور "ویری سوری"[2] کی آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں۔

۱۹۳۲ء

1 Thank You 2 Very Sorry.

صحبتِ شب کی آخری گھڑیاں

(۱)

کیسی پُر لطف ہوں گی وہ صحبتیں جہاں ہر گوشہ سے انسانیت و محبت کے نغمے فضائے حیات میں گونجتے تھے۔ اور کیسے مبارک ہوں گے وہ جلسے جن میں خوش نصیب آنکھیں وضع داری کی بہترین تصویریں۔ اور اسلام کے سچے نمونے دیکھتی تھیں۔ دلی آج اِن صورتوں کو فراموش کر چکی اقلیم تعلقات میں وضع داری کے خوش رنگ پھولوں کی بجائے خود غرضی کی خاک اُڑ رہی ہے۔ چمنستانِ محبت اُجڑ چکا اور لحاظ و مروت کے گلہائے رنگین جل کر خاک ہو گئے۔ مگر شاہجہاں آباد اپنے سینہ میں ابھی وہ ہڈیاں چھپائے ہوئے ہے جو مملکت حیات میں انسانیت کے ایسے دریا بہا گئیں کہ دنیا اُن سے سیراب ہوئی دار السلطنت کی شوکت ظاہری سے فرصت پاکر جب سیاح ان کھنڈروں میں داخل ہوتا ہے جہاں فاختہ کی کوکو اُس کی سلامی اور بے ثمر درختوں کا سناٹا اس کا مہمان نواز ہو تو سب سے پہلے ویرانہ کی حسرت اس سے مصافحہ کرتی ہے حرماں نصیب ہوا کے جھونکے گلے ملتے ہیں۔ اور وہ دو چار ٹوٹی۔ چھوٹی اینٹیں

جو ابھی قابل ناز دفینوں کا پتہ دے رہی ہیں۔ اُس کے استقبال پر خوش آمدید کا نعرہ لگا دیتی ہیں۔

یہاں چشم ظاہر بیں کے واسطے راحت کا سامان نہیں ہے۔ یہاں اِن آنکھوں کی ضرورت ہے جو غور سے دیکھیں اور خموشی سے پڑھیں۔ اس جنگل کا ہر پتّہ اِن قبروں کی ہر اینٹ اِس خاک کا ہر ذرّہ ایک کتاب ہے۔ ایک تاریخ ہے۔ ایک سبق ہے۔ یہ زندوں کا جلسہ نہیں۔ اِن لوگوں کا مجمع ہے۔ جو بساط حیات پر قمر چہاردہم کی طرح چمکے۔ اور جن کے نام آج بھی دنیا سر آنکھوں پر رکھ رہی ہے۔ یہ غدر پہلے کی مردہ ہستیاں اور دَور جہالت کی بھولی بھالی صورتیں ہیں۔ مگر اِن مرجھائے ہوئے پھولوں میں مہک باقی ہے۔ اور اِن پھولوں کی ہر پنکھڑی صحبت شب کا پتہ دے رہی ہے۔ مناظر قدرت سے بہرہ ور ہونے والی آنکھیں اگر زمانہ فرصت دے تو آئیں اور غور سے دیکھ لیں، صبا ہر صبح و شام وفا کے پھول اِن مٹی کے ڈھیروں پر چڑھا رہی ہے۔ خلق اِن مردہ قدموں میں لوٹ رہا ہے۔ اور خلوص جو جوہر انسانیت ہے۔ عالمِ سنسان میں اِن بے خبر سونے والوں پر فدا ہو رہا ہے۔

(۲)

اللہ اللہ کیا وقت ہے۔ اور کیا لوگ ہیں مگر یہ وقت ٹلنے والا اور یہ لوگ رہنے والے نہیں۔ آفتاب یہی ہوگا۔ طلوع و غروب کے اوقات بجنسہ رہیں گے۔ لیکن وقت یہ نہ ہوگا۔ یہ اِن ہی لوگوں کی برکت اور ان ہی زندگیوں کی بہار ہے۔ کہ عالم حیات گلزار بن گیا۔ پُرانی عیدگاہ کی مشرقی سمت اِس

چٹیل میدان میں چلو۔ ظاہری آنکھیں بند کرو۔ اور دل کی آنکھیں کھول لو کچھ صورتیں نظر آئیں گی۔ کچھ ہستیاں دکھائی دیں گی۔ جن کے دل بھلائیوں کا مجموعہ اور حسنات کا مخزن ہوں گے۔ ان کے اعمال دیکھو۔ ان کے افعال پر نظر ڈالو۔ یہ مراحل موت وزیست سے آشنا ہیں۔ اور منازل دین و دُنیا ان کے پیش نظر۔ یہ وہ ہیں جن کی زندگیاں بحر دنیا میں درشاہوار بن کر چمکیں۔ اور جن کو موت نے عالم ارواح کی صف اولین میں پہنچا دیا۔ یہ وہ ہیں۔ جو پھول کی طرح رہے۔ اور خوشبو کی طرح گئے۔ وہ جو فیض عام کے چشمے بہا۔ اور بقائے دوام کے نام چھوڑ گئے۔

اِس خاک کے اونچے نیچے ڈھیر میں ایک مہ کامل دفن ہے۔ اور چند اینٹیں رہبر سیّاح اور املی کی پتّیاں اِس خزانہ کی محافظ ہیں۔ یہ بائی جی کا جسد خاکی ہے۔ جو ستّرہ کے عدد کی عامل تھیں۔ کلام الٰہی کی عاشق اور سور کوثر کی فریفتہ۔ یہاں ایک چھپر تھا جس کے بانسوں اور رپولوں پر قصر سلاطین قربان تھے۔ اور بڑے بڑے اُمرا اور رؤسا اِس خاک کو بوسہ دیتے تھے یا چلو کھڑے ہو اور دیکھو سوچو اور غور کرو۔ جو پھول آج مُرجھا گئے۔ جو جوہرات اب مٹ گئے دنیا جن باتوں کو ترس رہی ہے۔ دلّی جن نفوس مقدّسہ سے تعبیر تھی وہ سب آناً فاناً نظر آجائیں گے۔ اِن ہڈیوں کا فیض تمہارا مدد گار ہو گا۔ شوق کے قدم اُٹھاؤ اور دل کی آنکھیں وا کرو۔ یہ اُجاڑ موسم بہار ہے۔ اور یہ خاک سرمۂ چشم۔

(۳)

شام کا اندھیرا۔ غروب آفتاب کی خبر لے آیا۔ رات کی سیاہی نے اس لئے

کہ عورت ذات تھی۔ رحم کی زبان سے قدرت کا پیام راحت پردۂ زمین کے کان تک پہنچا دیا۔ ڈوبنے والا آفتاب باعتبار ہیئت ایسا ہی تھا۔ جو آج چمک رہا ہے مگر بلحاظ قدامت قریب قریب ایک صدی چھوٹا۔ مسجد عیدگاہ نے گل توحید کی مہک سے بساط مغرب کو مہکا دیا۔ اذان و تکبیر کی صدائیں گونجیں اور امام کے سلام کا غلغلہ بلند ہوا۔ مسجد کا صحن جو اس وقت کھنڈر رہے دالان اور درے جہاں خاک اُڑ رہی ہے۔ بندگان خدا سے کھچا کھچ بھرے ہیں۔ میرے دوستو! الفاظ میں اِس وقت کی تصویر کھینچنی آسان نہیں۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی وہ مسلمان نہیں آ سکتے۔ وہ لوگ تو در کنار جو کچھ میری آنکھیں شاہجہان آباد میں دیکھ چکیں۔ آج وہ سماں کوسوں نظر نہیں آتا۔ میری آنکھیں اُن صورتوں کو ترس رہی ہیں۔ اور میرا دل اُن حالتوں کو رو رہا ہے۔ جنہوں نے دلّی کو شاہجہاں آباد بنا دیا۔ وقت بدلا۔ ہوا بدلی۔ شہر بدلا۔ شہر والے بدلے رہنا سہنا بدلا۔ کھانا پینا بدلا۔ کھانے کے ڈھنگ بدلے۔ پانی کا رنگ بدلا۔ نماز ہو چکی۔ ایک پردیسی رئیس زادہ جس کے مُنہ پر پریشانی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اور چہرے کی افسردگی دل کی کلی کے مُرجھا جانے کا پتہ دے رہی تھی۔ پہلو میں عقیدتمند دل لیے مسجد سے باہر نکلا۔ یقین کے قدموں سے چلا۔ امیدوں کے سایہ میں بڑھا۔ حصول مقاصد کی آرزو دل کی تہہ میں پوشیدہ تھی۔ ہمہ تن شوق۔ باؔئی جی کے چھپر میں داخل ہوا۔ امیرزادہ فرش مخملی پر رہنے اور ایرانی قالینوں پر بیٹھنے والا تھا۔ دنیا کی فقیرنی کے ہاں جو دین کی شہزادی تھی۔ جہانوں کا تحفہ چادر خاک تھی۔ پردیسی امیر اکیلا نہ تھا۔

کچھ بہنر تھے کچھ بد تر تھے، دولت مند بھی تھے محتاج بھی۔ لیکن اِس دربار میں سب مساوی تھے جو مٹی زرین لباسوں کا بچھونا تھی۔ وہی پرانے کپڑوں اور برہنہ جسموں کی۔ لیکن یہ خاک ہر قسم کی آلائشوں سے پاک تھی۔ جس پر بائی جی کے متبرک ہاتھ روزانہ جھاڑو دیتے اور ایسا بنا دیتے کہ خاک عیدگاہ آج تک مشہور ہے ✚

عزیزو! اگر تمدن جدید اجازت اور تکلّفات مغرب فرصت دیں تو اس خاک پر بیٹھ جاؤ۔ اور اِس صحبت کو دیکھ لو یہ صف بستہ مسلمان معمولی انسان نہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے سروں پر وضع داری کا مرصع تاج جگمگا رہا ہے۔ اور جن کے پاؤں میں خلوص کے دریا لہریں لے رہے ہیں۔ آندھی کا جھکڑ ہو یا بارش کا طوفان۔ اُن کی حاضری ناغہ نہیں ہوتی۔ یہ بیمار بھی اسی گوشہ میں آپڑتے ہیں۔ اور جس خاک کو ایک دفعہ آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کو کلیجہ سے جُدا نہیں کرتے۔ بائی جی مصلّے سے اُٹھیں۔ نون سے افطار کر چکی تھیں مٹّی کی ہنڈیا کھولی۔ بجھڑی کی ایک روٹی کے سترہ ٹکڑے کیئے۔ اذن عام تھا بھورا بھورا سب نے چکھا۔ سترہ گھونٹ پانی کے پیئے۔ ہاتھ دھوئے۔ کلّی کی سترہ دفعہ شکر کیا۔ اور حاضرین کی طرف متوجہ ہوئیں:۔

غور سے دیکھ لو تسبیح سب کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کا ذکر ہے۔ دین کے چرچے ہیں۔ علم و فضل کے چشمے اِس چھپّر سے پھُوٹ رہے ہیں۔ اور سلوک و جذب کے مراحل یہ خاک بہ آسانی طے کر رہی ہے ✚

دُنیا کے جھگڑے بیان اور عاقبت کے معاملات پیش ہوئے۔ بائی جی کے

مُنہ سے پھُول جھڑے۔ اور سامعین نے اِن پھُولوں سے اپنی گودیاں بھریں ایک شخص کی طرف دیکھا اور فرمایا:۔

"بھائی چُپ چُپ کیوں ہو؟"

شخص۔ "گھر میں طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ بخار کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتا کھانسی کی تکلیف اور بھی مرے پر سو دُرّے ہے۔ دوپہر سے دو دفعہ ضعف آ چکا ہے۔"

بائی جی۔ "تو بھیّا تم کیوں آئے۔ شاید وہاں ضرورت ہو جائے۔"

شخص۔ "ارادہ تو کیا تھا مگر دل نہ مانا۔"

بائی جی۔ "ہمیں خبر کر دیتے۔ ہم سب وہیں آ جاتے۔"

شخص۔ "خدا اُس کو بچائے۔ حالت اچھّی نہیں ہے۔"

بائی جی۔ "دق کا اچھّا ہونا مشکل ہے۔ کوشش میں کمی نہ کرو۔ اور خدا پر چھوڑ دو۔ اب تم جاؤ۔"

شخص۔ "دل تو وہیں پڑا ہوا ہے۔ مگر یہاں سے اُٹھنے کو بھی جی نہیں مانتا ابھی تو عشاء میں دیر ہے۔ اپنے وقت پر چلا جاؤں گا۔"

بائی جی اِس کے بعد خاموش تھیں۔ مجلس میں سنّاٹا تھا۔ نظر نووارد پر پڑی امیر زادہ انتظار کے پہلو بدل رہا تھا۔ پوچھا "آپ کہاں سے تشریف لائے"

رئیس۔ "لکھنؤ سے حاضر ہوا ہوں۔ عرصہ سے قصد کر رہا تھا۔ اب پُورا ہونے کا وقت آیا۔ کچھ عرض کرنا ہے۔"

بائی جی۔ "کہو؟"

رئیس "چاہتا ہوں کہ خدا کی محبت میں اس قدر مستغرق ہو جاؤں کہ کسی شے کا ہوش نہ رہے"!

بائی جی۔ "تم نے یا تم جیسے کسی اور انسان نے خدا کو اپنی آنکھ سے دیکھا؟"

رئیس "وہ آنکھ سے نظر آنے کی شئے نہیں ہے"!

بائی جی۔ "محبت تو اُسی سے ہو سکتی ہے جس میں جنسیت ہو یا مثلیت۔ اس لیئے بندے کی محبت خدا سے محال ہے۔ بندہ جس وقت مرحلہ فنا فی الرسول کو طے کر جائے تو وہ فنا فی اللہ ہو گیا"

میں جانتا ہوں کہ بائی جی کا جواب قابل بحث ہے۔ مگر یہ بحث نفس مضمون سے دور ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ وہ چرچے اب بھی کہیں نظر آسکتے ہیں۔ اور وہ صورتیں دکھائی دے سکتی ہیں جو ادھر تو اپنے ہاتھ سے بیجھڑ کی روٹی پکائیں۔ اُدھر محبت رسولؐ میں اس درجہ مستغرق ہوں کہ سوائے رسولؐ اللہ کے اور کوئی دوسری شئے نظر نہ آئے؟

(۴)

آج یہ جلسے خواب و خیال ہیں۔ اور وہ متبرک صورتیں جو دلی کی خاک سے اُٹھیں۔ اِن کھنڈروں میں آرام کر رہی ہیں۔ خوش نصیب ہیں۔ جہان آباد کے وہ سیاح جن کو یہ دو تین اینٹیں صحبت شب کی آخری گھڑیاں یاد دلا دیں شہر بہت کچھ ترقی کر گیا۔ شہر والے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ مگر ے

ہم جس کو ڈھونڈھتے ہیں وہ ہے ہاں ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

نظام المشائخ۔ ۱۹۳۶ء

اگلے لوگوں کی ایک جھلک

غدر ۱۸۵۷ء کی مصیبت نے جہان آباد پر قیامت ڈھا رکھی تھی۔ کالوں کی
عارضی حکومت نے گورے، اور کالے کا امتیاز اُٹھا دیا تھا۔ گورا اس لئے
کہ گوری رنگت رکھتا ہے، اور کالا اس لئے کہ باغی ہے واجب القتل تھے۔
امیر اس واسطے کہ دولت والا ہے، اور غریب اس لئے کہ مُفلس ہے گردن
زدنی۔ دین دین کے نعروں نے جن کے استقبال میں ننگی تلواریں صف
بستہ حاضر تھیں شہر سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ پوربیوں کی حکومت نے پانی کے
بلبلہ کی طرح جس کی مدّتِ حیات ایک دو لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یا باغ کے
اُس پھول کی مانند جو اپنی بہار و خزاں ایک رات میں ختم کرتا ہوا علی الصباح
بلبل کے لاتعداد نالے اپنے ساتھ لے کر دامنِ گلچیں میں پہونچ جاتا ہے۔
گلیوں، اور کوچوں میں، محلوں، اور سڑکوں پر خون کے پرنالے بہا رکھے تھے۔
میرے جد امجد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور ان کے بہنوئی
شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب مغفور محدث دہلوی مسلمانوں کی
نگاہ میں اس وجہ سے کافر ٹھیرے کہ ان لوگوں نے جہاد کے فتوے پر دستخط

نہیں کئے۔ اب ان کے مدارس و مساجد میں صبح سے شام تک بجائے قرآن و حدیث کے مفسدوں کی گالی گلوچ، اور نماز و اذان کے بدلے تلواروں اور بلموں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ ایسے نازک وقت میں جب حق و انصاف کا جنازہ نکل چکا تھا، دلائل و براہین قبروں میں پہونچ چکے تھے علماء کے اس گروہ کا ایمان کو قائم رکھ کر موت کو دعوت دینا اُن ہی کا کام تھا، چار پانچ روز تک علماء کے کفر کا مقدمہ مفسدوں کے سامنے پیش رہا۔ آخر ایک روز چار پانچ آدمی نماز فجر کے وقت مسجد میں داخل ہوئے۔ اِدھر مولوی عبدالقادر نے سلام پھیرا اُدھر ایک پوربیئے نے ان کا ہاتھ جو دعا کے واسطے اُٹھ رہا تھا گھسیٹ کر کہا۔

"باگی ان کا منڈہ توہئیں بتر اٹنتا چکا دیں

(یعنی تو ہی باغیوں کا سردار ہے۔ بترا باپ کاٹ دیتے ہیں)

پوربیئے کے ہاتھ میں بلم تھا، مگر دفعتًا اس کے ہمراہیوں کی آواز باہر سے غل غپاڑے کی آئی، اور یہ سب مولوی صاحب کو چھوڑ چھاڑ چلے گئے۔ دن بھر مولانا مرحوم مسجد میں رہے۔ عصر کی نماز پنجابی کٹرہ کی مسجد میں جو ریلوے اسٹیشن کی نذر ہوئی پڑھتے تھے، چنانچہ وہاں تشریف لے گئے، اور مغرب پڑھ کر واپس ہوئے۔

اب وہ وقت آتا ہے جس کو سُنکر دورِ حاضرہ سناٹے میں رہ جائے گا اور معلوم ہو گا کہ قرونِ اولی کے نہیں اس گئے گذرے زمانہ کے مسلمان بھی حق و

وصداقت کے معاملہ میں دنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے۔ راستی اُن کے گھر کی کنیز اور حقیقت اُن کی بال باندھی لونڈی تھی۔ اُن کی زندگی ایمان کے سایہ میں گذرتی تھی۔ اور اُن کی دنیا کے سامنے دین کا تاج زرّین ہر وقت جگمگا رہا تھا۔ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم جوانی کی حدود سے تجاوز کر رہے تھے۔ بڑھاپا اُن کے شباب کو فنا کر چکا تھا۔ مگر جوانی جیسے بیش بہا جوہر گم شدہ کے آثار ابھی چہرے پر موجود تھے۔ لاہوری دروازے کے پاس اُنہوں[1] نے کسی کے کراہنے کی آواز سُنی۔ یہ ایک مظلوم انسان کی صدا تھی جو اُس شخص کے کان میں آئی جس کی موت کا اس جرم میں فیصلہ قطعی ہو چکا تھا، کہ وہ انگریزوں کی دشمنی میں باغیوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ زخمی کے نالوں نے مولانا کو اپنی طرف کھینچا، اور انسانیت کی رہبری قریب لے گئی، تو کیا دیکھتے ہیں، کہ ایک انگریز عورت خون میں شرابور زخموں میں چکنا چور دم توڑ رہی ہے۔ گو تکلیف کی شدت نے دست و پا بیکار کر دیئے ہیں۔ مگر موت کی پیاس پانی کا تقاضا کر رہی ہے۔ ایک بدنصیب زخمی انگریز عورت کے سرہانے ایک مسلمان مرد کا جس کے قتل کا فتویٰ بغاوت کے جرم میں صادر ہو چکا ہے۔ کھڑا ہونا آسان کام نہ تھا دل کہہ رہا تھا کہ ظالم اگر اُڑتی سی خبر سُن پائیں گے تو بوٹیاں چیل کوّوں کو کھلاویں گے۔ انسانیت اور ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ جان صداقت پر قربان ہو، ایک بے گناہ عورت کی حمایت میں ہر مصیبت راحت، اور ہر اذیت مسرت ہو گی۔

مَیں ارتقا کے اس مسئلہ سے واقف ہوں، کہ طاقتور کا کمزور کو فنا کر دینا جائز حق ہے

[1] مولوی نذیر حسین محدث دہلوی؟ بھی ہمراہ تھے

اور اسی کے تحت میں میں اس واقعہ کو جائز سمجھ رہا تھا جب ایک مہینے کے قریب ہوا، کہ ایک نوجوان سائیکل سوار نے ایک بڈھے کہار کو جس کے کندھوں پر ڈولی تھی اس جرم میں خونم خون کر دیا کہ گلی تنگ ہونے کی وجہ سے بڈھا جوان کو رستہ نہ دے سکا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مناجات یاد آئی جس میں شیخ خالق الموجودات کے حضور میں گڑگڑا کر جن چیزوں کا واسطہ دے رہا ہے۔ اُن میں جوانوں کی صداقت، اور بڈھوں کی اطاعت کا حوالہ ان الفاظ میں دیتا ہے۔

بہ صدقِ جوانانِ نوخاستہ   بہ طاعاتِ پیرانِ آراستہ

سبحان اللہ، سبحان اللہ شباب و ضعیفی کے مدارج کو کس خوبصورتی سے طے فرمایا ہے اور دونوں کیفیتوں کو ملحوظ رکھ کر کیسے چپے تلے الفاظ کہے ہیں، واہ واہ جوانوں کی صداقت میں انسانیت کی ہر صفت آگئی۔ ارتقائی فلسفہ درست لیکن انسانیت کی کسوٹی بھی کچھ وقعت رکھتی ہے، اور وہی شیخ کے سامنے ہے کاش مسلمان سائیکل سوار اس جوہر سے باخبر ہوتا۔ یہی واقعہ مجھ کو صداقت و طاعت کی طرف لے گیا اور معاً مجھ کو اپنے جدامجد کی یہ حقیقت یاد آگئی جس کو قلمبند کر رہا ہوں۔

رات کے ابتدائی حصہ میں جب دنیائے اسلام کا سر خدائے عزوجل کے حضور میں جھکا ہوا تھا تو مولوی عبدالقادر صاحب ایک انگریز عورت کو کندھے پر لئے گھر میں داخل ہوئے۔ زخمی خاتون سسک رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور جسم کے اکثر حصوں سے خون نکل رہا تھا گھر کی عورتیں اپنے بدنصیب مہمان کی تیمارداری میں مصروف ہوگئیں، زخموں کو دھویا بدن صاف کیا۔ پانی اور

شربت حلق میں ٹپکا رہے تھے۔ دو بجے کے قریب دروازے پر دین دین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ اس شخص کا گھر ہے جس کی موت کا مسئلہ صبح ہی طے ہو چکا تھا۔ اور یہ وہ عورتیں ہیں جو دن بھر شوہر اور باپ کی موت کو رو چکی ہیں، اور یہ اس شخص کے قتل کی کوشش ہے جو جہان آباد کو انسانیت کے معنی بتا رہا ہے۔ غریب عورتوں کی جان نکل گئی بھولے اور سیانے بچوں کے ہوش جاتے رہے لیکن مولوی صاحب مرحوم نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ باغیوں نے دروازے پر آفت مچا دی اور دین دین کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا سوچتے سوچتے مولوی صاحب کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی اور وہ یہ کہ مہمان کو اُپلوں کی کوٹھری میں لٹا کر اُوپر سے اُپلے چن دروازہ کھول دیا۔

رات کے تین بج رہے ہیں، اور چودھویں کا چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے کہ پندرہ بیس آدمی مولوی صاحب کے گھر کی تلاشی لے رہے ہیں تلواریں اور بلم صاحب خانہ کے سر پر چمک رہے ہیں، اور دشمن عورتوں کے سامنے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ مولانا خاموش ہیں، عورتیں اللہ اللہ کر رہی ہیں۔ بچے رو رہے ہیں، اور لڑکے حسرت سے باغیوں کا منہ تک رہے ہیں، آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ اُپلوں کی کوٹھری کھلی اور وہ جفا کار اس میں داخل ہوئے۔

آج کے مسلمان اس کو اتفاق محض سے تعبیر کریں یا وقت سے میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ حاکم حقیقی ہر نیک کام میں اپنے بندوں پر رحمت کے پھول برسا کر دُنیا کو دکھا دیتا ہے، کہ کس طرح اس کا کرم شامل حال ہوتا ہے۔ خدا کا فضل ایک نہیں پندرہ بیس آنکھوں پر پردہ بن کر پڑا اور چاروں طرف دیکھ بھال کر باغی

چیختے پیٹتے واپس ہوئے۔

ہفتہ بھر سے زیادہ ہو چکا زخمی کی دوا نیم کی پتیاں، اور غذا مشکوں کا پانی ہے، مگر قدرت کے تماشے دیکھنے کے قابل ہیں، حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے زخم بھر رہے ہیں، اور دماغ لمحہ بہ لمحہ صحیح ہوتا جاتا ہے۔ باغیوں کا زور بھی ڈھے رہا ہے، دین دین کی آوازیں بھی کم ہو رہی ہیں، اور شہر کے بڑے حصے پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے، سترہواں روز تھا کہ صبح کے وقت مہمان نے میزبانوں سے رخصت طلب کی اور کہا صرف مجھ کو انگریزی کیمپ تک پہونچا دیجئے۔ یہ خواہش بھی کچھ کم خطرناک نہ تھی، مگر اب نسبتاً شہر میں، ابھی بھی تھی قتل وغارت کے واقعات پوری طرح بند نہ ہوئے تھے، لیکن وہ بے چینی نہ تھی۔

رات کے آخری حصے میں عورتوں نے اپنے مہمان کو وداع کیا، اور مولوی عبدالقادر صاحب نے اس انگریزی خاتون کو انگریزی کیمپ تک پہونچا دیا جدائی کے وقت میم صاحب نے میزبان سے یہ الفاظ کہے۔

"میں جب تک شہر کی حالت صحیح نہ ہو آپ سے نہیں مل سکتی، اور جس وقت تک انگریزوں کا پورا قبضہ شہر میں نہ ہو جائے، غالباً کوئی خدمت نہ کر سکوں گی اس عرصہ میں اگر کوئی موقعہ آجائے، اور میری ضرورت ہو تو میرا نام یاد رکھیے گا۔ مسز لیسن۔ میں آپ کے احسانات، اور آپ کی معزز مستورات کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی مجھ کو ہمیشہ یاد رکھیے گا، میں اطمینان ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی۔"

باغیوں کا قلع قمع ہو چکا قلعۂ معلّٰی پر انگریزی جھنڈا لہرا رہا ہے، اور مفسد اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں روزانہ آٹھ بجے کے قریب کنارِ جمن پر کوتوالی، اور دہلی دروازے کے باہر پھانسیاں ہوتی ہیں۔ اور مٹکاف صاحب کے ایک اشارہ پر بیسیوں بندگانِ خدا دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں.....
صاحب مرحوم جن کا نام لینا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا عبد القادر صاحب کے حقیقی ہم زلف مٹکاف صاحب کی ناک کے بال، اور مخبروں کے سردار ہیں۔
ان کی اطلاع پر مولوی عبد القادر صاحب مرحوم گرفتار کئے گئے، اور چار آدمیوں کی زبانی شہادت پر پھانسی کا حکم ہو گیا۔

وہ گھٹا جو کالوں کی بغاوت کا لباس پہن کر آسمانِ جہاں آباد پر نمودار ہوئی تھی اب اس سے خون کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا خاندان ہو گا جس کے گھر اور در ان چھینٹوں سے محفوظ ہوں۔ رات کے وقت جب مامتا کی ماریوں کے نالے بلند ہوتے تھے، تو سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اور صبح کے وقت جب گھونگھٹ کی دلہنوں کے خاموش آنسو بیوگی کی فریاد کرتے تو در و دیوار ان کے ساتھ روتے مصائب کے اس طوفان میں گنہگار اور بے گناہ سب بہہ رہے تھے۔ جہاں اطمینان و مسرت کی ریل پیل تھی وہاں کہرام مچے ہوئے تھے۔ دودھ پیتے بچے بلبلوں کرتے، اور حُسن کی دیویاں دو دو دانوں کو ترستیں۔ مخبروں کا راج اور پھانسیوں کا بازار گرم تھا۔ ہر وقت ست ہی ست پر جان تھی، کہ نہ معلوم کب گرفتار ہوں، اور پھانسی لگ جائے۔ پھانسی کے بہانے مٹکاف صاحب کی

جیب میں رہتے تھے، اور وہ اپنے سامنے درخت میں بندھوا دیتے تھے دو دو مجرم ایک ایک درخت کے نیچے پشت کی طرف مشکیں باندھ کر بٹھا دیئے جاتے تھے، اور صاحب کے حکم سے پھانسی ہو جاتی تھی۔

آج مولوی عبدالقادر کی پھانسی کا دن ہے صبح کے آٹھ بج چکے ہیں، گورہ فوج کا معمولی دستہ مسلح کھڑا ہے۔ مدرسہ اور مسجد کے متعلقین خاموش بیٹھے ہیں، کہ دو آدمی گھوڑوں پر سوار دلّی دروازے کی طرف سے نکلے، اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ تقدیر تھی یا اتفاق کہ دونو مجمع دیکھ کر ادہر چلے آئے ان میں ایک میم تھی اور ایک انگریز یعنی مسز لیسن اور مسٹر لیسن۔ مسز لیسن گھوڑا بڑھا کر قریب آئی تو مولوی عبدالقادر کو مشکیں بندھے ہوئے دیکھا، جیب میں سے پنسل نکال کر اپنی ٹوپی پر لکھا "انتظار کرو" ٹوپی درخت پر لٹکا دی، پہرہ دار کو حکم دیا صاحب کو دکھا دینا اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اب نو بج چکے ہیں، لوگ متحیر ہیں کہ یہ کیا ہوا، اور میم کیا کرے گی۔ مٹکاف صاحب آ گئے، اور مجرم پھانسی کے واسطے تیار ہوئے کئی آدمیوں کو پھانسی ہوئی۔ مولوی صاحب کے درخت پر ٹوپی دیکھ کر مٹکاف صاحب ادہر اُدہر ٹہلنے لگے۔ ایک رتھ اور اس کے ساتھ گھوڑے پر میم صاحب آتی ہوئی دکھائی دیں، رتھ میں میری دادی صاحبہ یعنی مولوی صاحب کی بیوی جو "بڑی استانی صاحبہ" کے نام سے شہر میں مشہور تھیں، تشریف رکھتی تھیں، ان کے ساتھ ان کی لڑکیاں اور بچے بھی تھے جنہوں نے صبح سے رو رو کر خون کر رکھا تھا مٹکاف صاحب نے میم صاحب کی صورت دیکھ کر ٹوپی اُتاری ہاتھ ملایا، اور پوری داستان

سُننے کے بعد اپنے ہاتھ سے مولوی صاحب کی مشکیں کھول کر حکم دیا قاری .... مخبر کو حاضر کرو تعمیل میں کیا دیر تھی قاری صاحب ڈرتے اور روتے کانپتے اور ہانپتے حاضر ہوئے صاحب نے اپنے ہاتھ سے ان کی مشکیں باندھ کر حکم دیا اُس کو فوراً لٹکا دو۔

جب قاری صاحب پھانسی پر چڑھنے لگے تو مولوی صاحب کی خواہش پر میم صاحب نے سفارش کی اور قاری صاحب اس شرط پر چھوڑے گئے کہ دو سال کے واسطے شہر سے باہر چلے جائیں۔

آج قاری صاحب، اور مولوی صاحب دونوں کی ہڈیاں خاک ہو چکیں۔ مگر ان کے اعمال موجود ہیں، اور انسانیت کی کسوٹی پر کسے جا رہے ہیں۔

مٹکاف صاحب نے مولوی صاحب کو رتھ میں بٹھایا، اور مسز لیسن کو ساتھ لے کر چھاؤنی روانہ ہوئے، شام کو ایک بہت بڑی دعوت ہوئی جس میں مولوی صاحب اور مسز لیسن لنچ میں برابر برابر بیٹھے، اور مٹکاف صاحب نے مولوی صاحب کو بہت سے انگریزوں سے ملوایا۔

مسٹر اور مسز لیسن اس کے بعد مولوی صاحب کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ پنشن کے بعد بھی ولایت نہ گئے، اور دہلی میں رہ پڑے۔ ہر سال مسز لیسن کے اس واقعہ کی سالگرہ منائی جاتی تھی، اور مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔

مسز لیسن کی کوٹھی کشمیری دروازہ کے باہر تھی، اور ہر جمعہ کو دوپہر کا کھانا مولوی صاحب اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ کھاتے۔ میں بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ اور دیکھتا تھا کہ مسز لیسن کس طرح مولوی صاحب کے احسان کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

عصمت ۱۹۳۳ء

اگلے لوگوں کی باتیں

جس طرح آسمان دیکھتے ہی دیکھتے رنگ بدلتا ہے، کہ ابھی تاروں بھری رات سر پر ہے اور ابھی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ یا گرگٹ بیٹھے ہی بیٹھے کبھی لال کبھی سبز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زمانہ بھی رنگ بدلتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کسی حالت کو قرار نہیں جو کیفیت ہے وہ عارضی ہمیشہ رہنے والی وہی ایک ذات ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔ مولانا اکبر حسین نے کیا خوب فرمایا ہے

جو ہنس رہا ہے وہ ہنس چکے گا۔ جو رو رہا ہے وہ رو چکے گا
سکونِ دل سے خدا خدا کر جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

شادی کا موقعہ ہے طرح طرح کی اُمنگیں دل میں پیدا ہو رہی ہیں۔ کپڑا لتہ گھنا پاتا تیار ہو رہا ہے، مبارک سلامت کی دھوم دھام ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ شادی کا وقت آ گیا۔ اور وہ امیدیں، اور امنگیں جو ماں باپ کے دلوں میں تھیں ختم ہو گئیں۔ وقت آ بھی گیا اور چلا بھی گیا۔

بیمار کے بچنے کی امید نہیں دوائی ٹھنڈائی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر، اور حکیم، بدلے جا رہے ہیں۔ آخر سب کوششیں بے سود ٹھہریں۔ موت آ پہنچی، اور سب

سب کچھ ہو گیا۔ یہ وقت بھی آیا اور گیا۔

غرض دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ کہ کسی چیز کو اور کسی حالت کو قرار نہیں۔ مسلمان آج سے پچاس سال پہلے جن باتوں کو عیب سمجھتے تھے آج وہ ہنر ہیں، اور آج جو ہنر خیال کئے جاتے ہیں اس وقت عیب تھے، پہلی دلہنیں شرم و حیا میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں، آج شرم و حیا کی ہنسی اُڑتی ہے۔

غدر کے بعد مسلمان جن جواہرات سے مالا مال تھے آج وہ ماند پڑ گئے لیکن ابھی وہ نظریں زندہ ہیں جو اب بھی ان کی آب و تاب پر سر دھن رہی ہیں۔

میرے عم محترم شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی مالی حالت خاندان میں سب اچھی تھی۔ ان کی ایک نہایت قریبی عزیز نسبتہً غریب تھیں۔ اتفاق سے دو سال بارش نہ ہوئی، اور قحط پڑ گیا۔ اور اچھے اچھے کھاتے پیتے لوگ پریشان پھرنے لگے۔ یہ بیوی بھی بہت تکلیف میں پھنس گئیں۔ ان کی اذیت اور پریشانی کا علم جب مرحوم عم مکرم کو ہوا تو پچاس روپے ان کو دیئے، اور فرمایا کہ ان کو اپنی ضرورتوں میں صرف کرو، انہوں نے گردن جھکا کر اس لئے کہ رشتہ میں چھوٹی تھیں سلام کیا گویا آج کل کا "تھینک یو" ادا کیا۔ اور بات گئی گذری ہوئی۔ دوسرے یا تیسرے روز یہ بیوی میری بڑی پھوپی۔ یعنی ڈپٹی صاحب مرحوم کی بیوی کے پاس گئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد روپے واپس کئے اور کہا۔

"آپا۔ یہ روپے بھائی صاحب کو واپس کر دیجئے۔ ابھی میری حالت ایسی نہیں ہوئی۔ خدا بچوں کو زندہ رکھے۔ ان کی کمائی کافی ہے۔"

اس واقعہ کے چند سال بعد مولوی صاحب مرحوم کی ایک نہایت قریبی لڑکی ان بیوی کے بچہ کو جو بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا بیاہی گئی، جب دُلہن کی روانگی کا وقت آیا تو دولہا کی اماں نے ڈپٹی صاحب کی بیوی سے کہا۔

"آپا خدا کا شکر ہے، میں اپنی بہو کی نگاہ میں حقیر نہیں ہوں۔ اگر اس وقت وہ روپیہ لے لیتی تو روپے تو چند روز میں ختم ہو جاتے۔ مگر میری نگاہ ہمیشہ کو نیچی ہو جاتی اور یہ منہ بہو کو دکھانے کے قابل نہ ہوتا"

عم مرحوم کو جب یہ خبر پہونچی تو انہوں نے دلہن کی اما سے کہا "تمہاری حیثیت ہم سے بلند ہے۔ تم دولہا کی اما ہو۔ کچھ شک نہیں تمہاری عاقبت بینی مستحق تحسین ہے، کہ تم نے اپنی دوراندیشی سے آج اپنی حیثیت کو کمزور نہ ہونے دیا"۔

اس واقعہ کے متعلقین سب مر گئے صرف دلہن اور اس کے بچّے جو معزز عہدوں پر ممتاز ہیں، موجود ہیں۔ موجودہ نسل جب اس واقعہ کو یاد کرتی ہے، تو بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے، کہ کیسی غیور اور خود دار بی بی تھیں کہ افلاس کی تکلیف اٹھالی مگر وضع میں فرق نہ آنے دیا۔

عصمت ۱۹۳۲ء

انقلابِ تمدّن

تڑپ، تڑپ، دل بے قرار تڑپ، اور ان صورتوں پر خون کے آنسوؤں سے رو، جنھوں نے آبادی چھوڑ، جنگل بسائے، گئے اور ایسے داغ دے کر گئے، جو ہمیشہ تازہ رہیں گے، عمر کہیں سے کہیں پہونچ جائے مگر ان کی یاد دل سے نہ جائے گی، آنے والا زمانہ ان کے نام آنکھوں سے لگائے گا۔ اور یہ فانی دنیا ان کی ہستی پر فخر کرے گی۔

راتیں، اور دن، ہیں تو ویسے ہی، مگر! لوگ وہ نہیں ہیں ختم ہو گئے وہ دن، صبح ہو گئیں وہ راتیں، اور مٹ گئے وہ لوگ، غدر ۱۸۵۷ء سے برسوں پہلے کا وقت ہے، اور زندہ ہیں وہ صورتیں، جن کے قدم سرزمین جہان آباد، آنکھوں سے لگا رہی ہے۔

دلی، بگڑ بگڑ کر بنی، اور بن بن کر بگڑی مگر پھر اس خاک سے ویسے لوگ نہ اٹھے، یہ عالیشان محلوں، اور پکی محلسراؤں کے رہنے والے نہیں ہیں، ان کے گھر ہیں تو کچے دھابے، اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، مگر لپے پتے صاف ستھرے، لیونڈر کا تو انھوں نے نام بھی نہیں سنا مگر چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی

خوشبو ان کی سادگی مذاق کا پورا پورا پتہ دے رہی ہے۔
اِن کے دماغ مغربی ہوا کے جھونکوں سے آشنا نہیں ہیں، مگر آنکھیں، کبھی کبھی، ایک آدھ صورت ایسی بھی دیکھ لیتی ہیں، جو ان کو ششدر و متحیّر بنا دیتی ہے، ان کی صورت ظاہری لباس پوشاک وضع و قطع نہ چنداں دلچسپ ہے، نہ دلکش، قبّہ دار ٹوپیاں۔ چُنّٹ دار انگرکھے، کمر میں پٹکے، ہاتھ میں عصا، جیب میں لمبے لمبے رومال، مگر ان کے باطن پر کائنات کا ہر ذرّہ درُود پڑھ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں پابندی وضع جن کی گھٹّی میں پڑی، ہمدردی کے دُودھ سے پلے، اور خلوص کے آغوش میں بڑے ہے، بساط تعلقات پر، قولاً و فعلاً، ایسے پھُول برسا گئے، جن کی خوشبو سے آج تک زمانہ مہک رہا ہے۔
یہ بھولی بھالی صورتیں، یہ سیدھے سادھے لوگ، جنھوں نے نمک کو، نون، اور چاقو، کو چکو اکہا، چند روز کے مہمان ہیں، کان، ان کی آوازوں، آنکھیں انکی صورتوں، اور دل ان کی، باتوں کو ترسیں گے، ملکۂ مغرب کی سواری کا غلغلہ بلند ہو چکا، یہ وہ سیمتن ہے۔ جس کے آگے زاہد صد سالہ سجدے کریں گے، اس کی ادائیں متقیوں کے دل بھی لوٹ پوٹ کر دیں گی۔ ان کی باتیں سُن لو اور صورتیں دیکھ لو، پھر یہ کہاں، اور تم کہاں، دیکھنا! دیکھنا! یہ پانچ برس کے دو چھوٹے ہوئے دوست ملے ہیں، سنو! سُنو!۔
ان کی باتیں سنو، اور یاد رکھو کہ محبّت کا سکّہ ان ہی کے دم تک اقلیم انسانیت میں چل رہا ہے، آگیا ہے وہ وقت، کہ مغرب کا دست شفقت اس تمدّن پہ پانی پھیر دے۔

"ہائیں! خلیفہ بندو؟ ارے بھائی کلیجہ سے تو لگ جا، صورت دیکھے مدتوں ہو گئے سنبھلے احمد بیگ کیا مرے وہ طبقہ ہی اُلٹ گیا، میاں بودی کالے کوسوں حیدرآباد پہونچے، سمندی کو، چچا امیر بیگ کی نظر کھا گئی، ہائے، بندو کیا کڑیل جوان اُٹھا ہے، دھیان آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے، اُبھائی ایک دفعہ اور رِیل، جی نہیں بھرا، ارے بیٹے ایک پانچ ہی برس میں ڈاڑھی بگلا کا پر ہو گئی، وہ ڈنڑ قبضے کچھ بھی نہ رہے"۔

بندو: "آؤ میاں یوسف آڑے! جب سے نہیں کہتے، کہ میں ہوں آڑے تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ شہر کے شہر میں ہوا اور اتنی خبر نہیں کہ بودی کو مرے تیسرا مہینہ ہونے آیا۔ بیچارے کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئی ہوں گی۔ کوئی ایسا ہی نصیبے کا ولی ہوگا۔ جو دکن جاکر جیتا جاگتا پلٹا ہو۔ تین کی سنا ونیاں تو ہم سن چکے ہیں۔ بودی کا بڑا لڑکا تو تمہیں یاد ہوگا، اُس نے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ سر اُٹھایا ہے کہ، ماں کو ناک چنے چبوا دیئے، دو ڈھائی آنے روز فقط چھٹے منٹھوں کو چاہئیں، وہ بیچاری مرکر صبح سے شام تک تین ساڑھے تین آنے کی مزدوری کر کے اُس کا بھرنا بھرتی ہے۔ پرسوں پیسہ پاس نہیں تھا، اس وقت کا جو نکلا ہوا ہے، تو اب تک نہیں پلٹا سڑنوں کی طرح روتی پھرتی ہے۔ صبح نماز دم دیکھتا کیا ہوں، کہ کنڈی کھٹکھٹا رہی ہے، میرا دل بھی دھکڑ دھکڑ کرنے لگا، کہ یہ گجر دم خدا خیر کرے۔ اس کو گھر میں بٹھا کر جو نکلا ہوں تو یہ وقت ہو گیا۔ پہاڑ گنج۔ نیلی واڑہ، صدر بازار، شہر بھر چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلتا۔ صبح سے نہار منہ ہوں، اب کہاں ڈھونڈوں، لوٹ کے

جاتا ہوں تو خرابی، اس بیچاری کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اب یہ سنا ہے کہ بلا پوٗ گیا۔ سو بھائی وہاں جا رہا ہوں چھ کوس کی منزل ہے، اور جھٹ پٹا ہو گیا ہے چلتے ہاتھ پاؤں جو کام ہو جائے اچھا۔ پھر تو ان کو کیڑے بھی نہیں کھائیں گے۔ خدا دیکھتا ہے، جو محبت بودی کے جیتے جی اُس کی اولاد سے تھی آج کے دم تک اس میں فرق نہیں آیا۔ میاں رشتہ نہیں ناطہ نہیں، مگر برابر کا یار تھا۔ اس کی بیوی دہاروں روئے اور ہم چپکے بیٹھے سیر دیکھیں۔ تم سے مل کر جی خوش ہو گیا اب تو جانے دو واللہ چاہے صبح ہی آؤں گا۔"

یہ ہیں وہ دل۔ جو حاضر و غائب ایک، اور ظاہر و باطن یکساں، اس جہالت پہ علم سو دکا تصدّق، اور ایسی بدتہذیبی پر، تہذیب ہزار بار قربان، مرے ہوئے دوست کی تصویر، جبتک زندہ رہے، آنکھ کے سامنے رہی۔ اپنا سکھ چین، عیش آرام اس کے بچوں پر نثار کر دیا، کیا لوگ تھے، کہ رانڈوں، اور یتیموں کو وارثو کی موت بھلا دی، مر گئے، مگر وضع کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جس سے جتنا مل لیے آخر وقت تک نباہ گئے، بے وقوف تھے، یا جاہل جیسے بھی تھے، اور جو کچھ بھی تھے۔ ایسے تھے، کہ یہ آسمان جو مدتوں ان کے سر پر چھایا رہا، آج حسرت سے ان کی قبروں پر رو رہا ہے، اور یہ زمین جو اُن کو کلیجہ سے لگائے پڑی ہے، بآواز بلند یہ صدا دے رہی ہے۔ کہ

مادرِ گیتی کے پیارو، تمہارے بعد تم جیسی صورتیں نظر نہ آئیں۔

بنئ وا اور رسائٹراسے کی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہوگئے زمانہ سرعت کے پروں سے اڑا چلا جارہا ہے، اور آناً فاناً نئے نئے انقلاب برپا ہورہے ہیں مگر لیسا غنیمت ہے یہ وقت بھی، کہ شرافت کے جوہر ہندوستانی تمدن میں اسی آب وتاب سے چمک دمک رہے ہیں۔

ملکۂ مغرب کا جہاز وسط سمندر میں اٹکھیلیاں کرتا چلا آرہا ہے، اور مشرق اس شاہانہ جلوس کے انتظار میں چشم براہ ہے۔ دُور کے ڈھول سہاونے، بچہ بچہ نئے مہمان کے آنے کی تیاریاں کر رہا ہے، مگر فلک پیر جس نے سینکڑوں قومیں اور بیسیوں ملک تباہ و برباد کرڈالے، ان کی ناتجربہ کاری پر ٹھٹھے مار رہا ہے، اس کی دوربین نگاہیں تاڑ چکی ہیں، کہ مشرق آج جس کو ہنر سمجھ رہا ہے ایک سو ہی برس کے اُلٹ پھیر میں مغرب کی صحبت اس ہنر کو عیب اس فخر کو ذلت اور اس وضع داری کو بیہودگی بنادے گی۔

وہی دن ہیں، وہی لوگ، مگر کیسے؟ وہ جو محبت کا خاتمہ اپنے ساتھ کر جائیں گے، اور زمانہ جن کا خلوص قیامت تک نہ بھول سکے گا۔

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا! کرتہ ہیں تو گھنڈی تکمہ ہی ہے، مگر اس جلتے بھلستے وقت میں کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے، سر پر بوجھ ڈھوئے چلے آرہے ہیں، ان کی صورت دیکھ کر ہنسو مت۔ ان کے گُن دیکھو، اور پھر کہو، کہ یہ کیسی صورتیں ہیں۔ غریب تین چار آنے روز کا مزدور ہے، مگر پڑھنے والوں کا کلیجہ کٹے گا۔ جب یہ سُنیں گے، کہ اپنی مزدوری چھوڑ کر، یہ گٹھری اُس بیوہ کے جو ہیں، جس کے

سر پر کوئی وارث نہیں، جو صبح سے بھوکی بیٹھی تھی، جو آس تک رہی تھی، کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مجھے جوڑا دے تو بیس کر اپنا اور اپنے ننھے ننھے یتیم بچوں کا پیٹ بھر لوں۔

ذرا اس کا جواب بھی تو سُن لو، جب اُنھوں نے آواز دی ہے۔

"لو بہن اپنے جوڑے جاؤ" تو بھوکی پیاسی جو صبح سے اللہ اللہ کر رہی تھی، اُٹھ کر دروازہ پر آئی۔ اس کی آنما دعائیں دے رہی تھی، مگر جب اس نے زبان سے شکریہ ادا کیا، تو کہنے لگے۔

"احسان کی کیا بات ہے؟"

"حق ہمسایہ، ما کا جایہ"

لیجئے مغربی ملکہ آ پہونچیں اُس وقت کو گذرے مدتیں ہو گئیں۔ اُنیسویں صدی کے دس برس نکل گئے آڑے، اور بڑے میاں جیسی صورتیں کبھی کی چھپ چکیں، آج مغربی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہے۔ مگر

چشم بینا سے دیکھنے والو! انصاف سے کہنا، دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ مشرق اپنے جوہر مغرب پر قربان کر چکا، اور آج وہ نازک وقت ہے۔ کہ سوسائٹی ان متبرک صورتوں کو انسانیت سے خارج بتا رہی ہے، لیکن فانی دُنیا کا ہر ذرّہ بہ صدا دے رہا ہے کہ زمانہ کتنی ہی ترقی کر جائے، مگر وہ بھولی بھولی اور پیاری پیاری صورتیں، اب آنکھوں کو دیکھنی نصیب نہ ہوں گی۔

تمدن ۱۹۱۱ء

دلّی کے بچھڑے لکھنؤ میں

جب زمانہ نے بساط زندگانی پر شرقی میزبان کو کروٹ دی اور مغربی مہمان نے ان سیجوں پر پاؤں پھیلائے، تو چشم بینا کیا دیکھتی ہے، کہ ایک ہی دور میں مشرقی پھول مغربی عینک سے کانٹے نظر آنے لگے۔ کچھ پرانی وضع کے رخصت ہوئے، کچھ بے گناہی کے بھینٹ چڑھے۔ بعض کو موت لے گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ صحبتیں ٹھنڈی، اور وہ جلسے برباد ہو گئے۔

۱۸۵۷ء تک کا زمانہ پھر غنیمت تھا۔ اس کے بعد تو مشرقی جواہرات ایسے ماند پڑے کہ کوئی اُن کو پوچھنے والا تک نہ رہا۔ اب بھی جو دو چار صورتیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی آنکھوں سے مجبور کانوں سے معذور۔ مشرقی موتیوں کے پرکھنے والے جوہری کہاں سے آئیں۔ عروس مغرب کی ادا دلوں کو مسخر کر گئی اب وہ صحبتیں کہاں، اور وہ لوگ کہاں۔ دل رہے، نہ زبان، بڈھے رہے نہ جوان۔ زمانہ کی رَو سب کو لے گئی۔ جن پھولوں نے ایک عالم مہکا رکھا تھا، ان کی پنکھڑیاں۔ رُلتی پھرتی ہیں، اور کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔

کہتے ہیں مشرق (باعتبار زبان) اتصال مغرب سے مالامال ہو گیا۔ ہو گیا ہو گا

ہم تو یہ دیکھتے ہیں، کہ وہ اگلا سارنگ روپ بھی ختم ہوا۔ لطف زبان تو مرنے والوں کے ساتھ گیا، اب اس کی تلاش فضول مگر سادگی جو زیور تھا وہ بھی نہ رہا۔ تحریر، تقریر، جس کو دیکھو آمیزش غیر سے لتھڑی ہوئی۔ موٹے الفاظ۔ بھدا اختلاط۔ اقتضاء وقت سے۔ سلاست میں رچی ہوئی زبان آج اس قابل ہے، کہ اغیار کی چھری گردن پر ہو، اور احباب خنجر قاتل کی داد دیں!

جب یارانِ طریقت ہی رقیب بن گئے تو دوسروں کی شکایت کیا، وہ اگلی چٹک مٹک وہ دِلربا انداز دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہوئے۔ رنگین دوپٹوں کی اوڑھنے والی مہ جبین آج مغربی لباس پہنے نظر آرہی ہے!

یہ ہی اُردو ہے، اور یہ ہی ہندوستان، مگر زمانہ یہ نہیں ہے۔ دلی بگڑ چکی۔ لکھنؤ۔ سعادت علی خان کے دم سے، اہلِ کمال کو سر آنکھوں پر رکھ رہا ہے، بھانت بھانت کے پکھیرو، اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ امین آباد میں ایک ساقن حقہ لئے بیٹھی اونگھ رہی تھی، کہ ایک بڑے میاں، برابر سے گزرے ٹھٹکے اور کہا "وحید النساء! تو بڑے کی خیر! ایک دو ہی برس میں سوکھ کر قاق ہو گئیں کالی کالی زلفیں بگلے کا پر اور تنا ہوا سینہ چھپٹی بن گیا!"

ساقن ۔"اوہو خلیفہ بندگی ہے۔ ارے بھائی بادشاہی کی بادشاہی نہ رہی، تو میں کس گنتی میں تھی۔ یہ دیکھو اس آنکھ میں پانی اُتر آیا، فجر سے شام تک ٹکریں کھاتی ہوں، جب کہیں چولھا سیدھا ہوتا ہے۔ صدموں نے اور بھی کمر توڑ دی۔ اسمٰعیل ایسا کڑیل جوان اُٹھا کہ رہے سہے ہوش جاتے رہے۔ دلی کیا چھٹی جینے کا مزا ہی چھوٹ گیا، اب تو پاپڑ بیلنے ہیں، جی کیا خاک رہی ہو

ایڑیاں رگڑ رہی ہوں۔ خلیفہ۔ علی کی قسم، ایمان سے کہنا دلّی میں بھی کبھی ساون میں خاک اڑتی دیکھی؟ ان دنوں میں زندگی کا مزا آجاتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں، زمانہ بدل گیا۔ میں کہتی ہوں، اللہ ہی وہ نہیں۔ بھلا یہ موسم، اور غضب خدا کا گجر دم پسینے میں نہا رہی ہوں۔ ذرا ہاتھ تو لگاؤ شور بہ شور ہو رہی ہوں۔

"شہر آبادی کے دن بھی کیا دن تھے، اسیر کی نفیری بجتے ہی جان میں جان آجاتی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ دھونتال پانی پڑ رہا ہے۔ جھولے پڑ رہے ہیں، پینگیں چڑھ رہی ہیں۔ مور جھنگھاڑ رہے ہیں۔ پپیہا کوک رہا ہے۔ جدھر دیکھو جل تھل۔ لبالب جھرنے۔ گھاس لہرا رہی ہے۔ ساون پر درخت آسمان پر ابر جھوم رہا ہے۔ وہ سماں گیا گذرا ہوا۔"

خلیفہ بندو۔ اری بُوا وحید النسا! وہ تو ایک خواب تھا، آنکھ کھلتے ہی تڑکا ہو گیا برسات ہی پر کیا موقوف ہے۔ بارہ مہینے، دن عید رات شب برأت تھی۔ ڈیڑھ اُنگلے آغا کی بیٹھک یاد ہے۔ کڑکڑاتے جاڑے دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ چار کے دور چل رہے ہیں۔ سماوار چڑھا ہوا ہے۔ آندھی جائے مینہ جائے یاروں کا جمگھٹ نہ جائے۔ مرزا احسن کو تو نظر ہی کھا گئی۔ اُن ہی کے دم کا غنچہ تھا۔ کہ چھ گھڑی کی توپ چھوٹتے سے پہلے سب اڑے ہوئے ہیں۔

پُورا مزا تو جاڑوں میں آتا تھا۔ دُنیا لحافوں میں مُنہ چُھپائے پڑی ہے۔ یوسف برف کی رکابی لیئے کھڑے ہیں، اور بعدے کے بعدے زبردستی منہ میں ٹھونس رہے ہیں۔ آج تم کو دیکھ کر پُرانے یاد آگئے۔ اب رہا ہی کون ہے۔

ایک بھودے سے نالفی کو سمجھ لو۔ سو وہ بھی جی گیا رہے ہیں سسک رہے ہیں گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گیا، کیا ہاتھی مرنڈا ہوا ہے؟

چشم مغرب کی گھائل آنکھیں ذرا۔ اس مشرقی بیگم کو بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ لیں اس کا لباس میلا چکٹ سہی، مگر سادگی اس کی نفاست پر قربان ہو رہی ہے۔ دلی کی ساقن، لکھنؤ کی سرزمین پر، بنگالے کی مینا بول رہی تھی۔ اب یہ دلکش صدائیں ختم ہوئیں۔ بسا غنیمت ہے کہ ابھی یہ مہ جبین زندہ ہے؟ مگر قریب آگیا ہے وہ وقت کہ اس کے فراق پر ہم جیسے رونے والے بھی رخصت ہوں۔

نوجوانو! عروس مشرق کی وداع مبارک۔ مگر شاہجہان کی پاک روح جس نے اس بچہ کو خونِ جگر پلا کر پالا ہے حسرت آمیز نظروں سے تمہارے کرم کی منتظر ہے۔

اس کا دل رکھنا اور کند چھری کو اتنا تیز کر لینا کہ بسمل نیم جان تڑپنا نہ رہے۔

لندن سنہ ۱۹۱۴ء

فسانۂ شب

بڑھاپے میں جوانی کی یاد، یوں ہی کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتی، اس پر طرہ یہ کہ جوانی کا بھی وہ وقت جو شباب سے تعبیر ہوا۔ آزادی سے چمٹا ہوا، اور بے فکری سے لپٹا ہوا۔

یارانِ قدیم کے لئے مضمون لکھنے کا قصد اس لحاظ سے نہایت جگر خراش تھا، کہ صحبتِ شب کا تمام سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ پر لطف جلسے جو مدتیں ہوئیں، کہ درہم برہم ہو چکے، یاد آئے، اور وہ پیاری صورتیں جو عرصہ ہوا، کہ رخصت ہوئیں، سامنے آ گئیں۔

عربی اسکول کا دورِ اول میں نے نہیں دیکھا اور شاید اس وقت کا دیکھنے والا اب کوئی بھی زندہ نہیں۔ مجھے اس رنگ کی ایک ہلکی سی جھلک یاد ہے۔ یہ یاد نہیں کہ مدرسہ اس وقت کہاں تھا، سکنڈ ماسٹر ایک صاحب سید علی یا سید حسین تھے میری عمر سات یا آٹھ برس کی تھی، اور اس بات کو پچاس برس سے زیادہ ہو چکے سید صاحب کی بابت یہ مشہور تھا، کہ ان کی ماں نے بیوگی میں بڑی مصیبت جھیل کر بچہ کو پڑھایا، اور وہ اس قدر سعادت مند ہیں، کہ جب تنخواہ ملتی ہے تو نہایت

ادب سے گردن جھکا کر ماں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، اور تنخواہ پیش کرتے ہیں مجھے ان کے متعلق اس سے زیادہ یاد نہیں، کہ وہ جوان مرے۔ مدرسہ میں جلسہ ہوا، اور ماسٹر شہاب الدین مرحوم نے ان کے متعلق جو تقریر کی اس میں خصوصیت سے اس سعادت مندی کا ذکر کیا تھا۔

دوسرے دور کا گٹھو طالب علم میں بھی ہوں۔ اس دور سے جو طلبہ نکلے، عربی سکول ان پر ہمیشہ فخر کر سکتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے دور کے لوگ ایڈیٹر بنیں۔ وکیل و بیرسٹر بنیں بی، اے، ایم، اے، ہوں، غرض کچھ ہی ہوں، مگر حالی جیسا استاد کہاں سے لائیں گے؟ بڑا ماننے کی بات نہیں ہے۔ یہ وہ کھیپ تھی جس کے ساتھ علوم کے اکثر جواہر اور شہر کی بہت سی وضعداریاں دفن ہو گئیں۔ مولوی اشرف حسین۔ مرزا محمد اشرف۔ خواجہ تصدق حسین۔ غلام محی حسن خان وغیرہ وغیرہ ایسے پایہ کے لوگ تھے، کہ کچھ نہ کیا مگر پھر بھی جو کر گئے ان کے بعد نہ ہوا، اور نہ ہونے کی امید ہے۔

میاں رؤف[1] یاران قدیم نکال کر، اور میاں آصف[2] یاران قدیم میں لکھ کر خوش ہو لیں، کہ مدرسہ کی خدمت کر رہے ہیں، مگر ضرورت یہ ہے، کہ ایسے طالب علم پیدا ہوں، جو مدرسہ کی لاج رکھیں، اور استادوں کے عاشق ہوں۔

شاید دو مہینے بھی نہیں ہوئے، مجھے ایک شادی میں شریک ہونے کا

---

[1] مرحوم سید رؤف علی بیرسٹر [2] مسٹر آصف علی بیرسٹر (مرتب)

اتفاق ہوا، ماسٹر فضل الدین صاحب بھی تشریف لائے۔ صحن میں ایک تخت بچھا تھا، آئے بیٹھے، اور چلے گئے۔

دلّی کے مسلمان شرفا کی شادیوں میں شاید ہی کوئی ایسی شادی ہوگی جس میں عربی سکول کے چند طالبِ علم نہ ہوں۔ اور میں نے اس شادی میں کئی طالب علم دیکھے بھی مگر زمانہ کا رنگ بدل چکا۔ اب عربی سکول کا فارغ التحصیل طالب علم سگرٹ پیتا ہوا بھی اپنے ماسٹر کو سلام کرلے تو اُس کی عنایت ہے۔

تیس برس سے کم نہیں زیادہ ہوئے ہوں گے، میرے پھوپی زاد بھائی مولوی انور حسین مرحوم کا نکاح تھا برات خان بہادر میر ناصر علی کے مکان پر گئی۔ خواجہ شہاب الدین صاحب مرحوم بھی شریک تھے۔ گیارہ بجے دلہن وداع ہوگئی۔ ولیمہ دوسرے روز تھا، مگر خاص آدمیوں کے واسطے کھانا اس روز بھی پکا تھا۔ ماسٹر صاحب چلنے لگے، تو سب کا جی چاہا، کہ وہ بھی کھانے میں شریک ہوں۔ خدا بخشے درخواست منظور کرلی، اور ساتھ تشریف لے آئے، مگر یہ فرما دیا، کہ بارہ بجتے ہی چلا جاؤں گا۔ اتنا سنتے ہی سب شاگرد کھانے کو لپٹ گئے۔ میں لال کنوئیں پر محمود نان بائی کے ہاں گیا، اور مارا مار تین چار شیرمالیں پکوائیں، اور جس طرح ہوا، ان کے سامنے کھانا رکھ دیا جب اس وقت کا خیال آتا ہے، تو کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ماسٹر صاحب اکیلے کھانا کھا رہے ہیں، اور ہم پانچ چھ آدمی سامنے حاضر ہیں، اور باغ باغ ہو رہے ہیں۔ کھانے کے بعد پانی طلب فرمایا میں لے کر گیا، تو اس میں تنکے پڑے تھے ہنسے اور کہنے لگے۔

"پانی بھی گنگا جمنی ہی پلاؤ گے!!"

اس روز ان کو کھانا لکھا کہ جس قدر خوشی ہم شاگردوں کو ہوئی ہے مشکل سے بیان ہو سکتی ہے۔

میری سب سے پہلی کتاب صالحات شائع ہو چکی تھی، ہم سب سڑک تک ہمراہ گئے چلتے کا وقت آیا تو ہم نے مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا ہنسے، اور فرمایا۔

"ارے میاں تم تو مصنف ہو گئے"۔

میں نے بصد ادب عرض کیا "آپ ہی کا طفیل ہے"۔ کمر پر ہاتھ رکھا، اور فرمانے لگے "بھئی جیتے رہو"۔

آنکھیں اب وہ سماں تو نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر جی یہ چاہتا ہے، کہ عربی سکول کے طلبہ اپنے استادوں کے ایسے ہی عاشق ہوں،

ماسٹر شہاب الدین مرحوم کے مزاج میں ظرافت بہت زیادہ تھی وہ سزا کے وقت بھی ہنستے رہتے تھے، ایک دفعہ مجھے بھی پٹنے کا اتفاق ہوا۔ قصور سنگین تھا آٹھ دس بیدیں ماریں مگر ہنس ہنس کر ہنسا ہنسا کر۔

سُنا ہے ایک موقع پر کمپنی باغ میں باجا بج رہا تھا میموں کی صف سامنے تھی، ماسٹر احسن بیگ سے فرمانے لگے "ذرا ان میموں کی کمریں تو ملاحظہ کیجے بالکل اُوگالدان معلوم ہوتی ہیں"۔

ماسٹر شہاب الدین مرحوم کے مزاج میں جس قدر ظرافت تھی مولانا حالی مغفور کے مزاج میں اُسی قدر سنجیدگی۔ شاید نویں جماعت کا ذکر ہے، مولانا حالی کا گھنٹہ تھا اور غالباً شاہنامہ کا سبق ہر طالب علم ایک ایک سطر پڑھ رہا تھا بیچارہ رہتک کا رہنے والا ایک سیدھا سادہ غریب طالب علم جس کو ہنسنے کی تمیز نہ رونے کی

جماعت میں شریک تھا، اس کے حصہ میں جو سطر آرہی تھی اس کا ایک فقرہ یہ تھا

"سر پیچ بمنی داشت"

سر کا "س" چھوٹا تھا اور نیچے کی سطر کا کوئی لفظ ایسا تھا جس کے نقطے سر کے نیچے تھے۔ اور س پر "پ" کا شبہ تھا۔ قاری سرفراز حسین اس رہتکی طالب علم کے برابر بیٹھے تھے۔ اس سے وہ فقرہ نہ چلا اور چپکے سے "اِن سے پُوچھا کہ کیا ہے۔" مرحوم قاری عجیب صنعت کے آدمی تھے۔ اس کو بتا دیا "پیر پیچ بمنی"

اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بمنی کی "ی" نہیں بولتی "پیر پیچ بمنہ"

وہ غریب اسی طرح پڑھ گیا۔ مولانا نے اس کی صورت دیکھی اور کہا "پھر فرمائیے" رہتکی بیچارہ نے پھر پڑھا "پیر پیچ بمنہ" مسکراہٹ تو مولانا کو بھی آئی مگر ضبط فرمایا اور حسب عادت کہنے لگے۔

"ہالم بخت، پھٹے سے منہ، لعنت خدا کی"

یہ ملحوظ رہے کہ بمنہ کبوتر کی ایک قسم ہے۔

معاً مولانا کا ذہن قاری مرحوم کی طرف جو برابر تشریف فرما تھے منتقل ہوا اور فرمانے لگے

"قاری صاحب یہ جناب کی عنایت ہے۔ یہ بدبخت کیا جانے کہ بمنہ کسے کہتے ہیں۔ کھڑے ہو جائیے"

اب جماعت ہنس رہی ہے اور قاری صاحب سر کھجا رہے ہیں۔

یاران قدیم ۔ ۱۹۲۶ء

دِلّی کے روزے اور عیدیں

شاید دو چار صورتیں اب بھی کہیں نہ کہیں ایسی موجود ہوں گی جنھوں نے دلّی کے مسلمانوں کا نصف صدی یعنی پچاس سال پہلے کا تمدن دیکھا ہوگا، اُس تمدن میں مذہبیت آج کل سے زیادہ تھی، اور مسلمانوں کے گھر معلوم ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر رمضان اور عید کو لیجیے، اِس وقت روزہ دار عورتوں کی تعداد بلاشبہ اُس وقت سے کم نکلے گی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ کہی جاسکتی ہے کہ نسوانی صحت روز بروز روبہ تنزل ہے۔ اُس وقت عورتیں اِس قدر بیمار نہ ہوتی تھیں، جس قدر اب ہوتی ہیں۔ جب زنانے اسپتال تھے نہ لیڈی ڈاکٹر۔ انگریزی دائیاں تھیں نہ شفاخانے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس وقت عورتوں کو علاج میں یہ آسانی نہ تھی۔ جواب ہے۔ ایک حد تک یہ کہنا درست ہوگا لیکن اُس وقت اتنی ضرورت بھی نہ تھی جتنی اب ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اِس قدر کام کرتی تھیں، کہ مردوں سے زیادہ اُن کی ورزش ہوجاتی تھی۔ اب یہ بات مفقود ہے۔ مامائیں آج کل کے مقابلہ میں کم تھیں بڑے بڑے رئیسوں اور امیروں کے ہاں دو ایک مامائیں ہوتی تھیں۔ اُس وقت کے

پچاس آج کل کے ڈھائی تین سو کے برابر تھے۔ لیکن اس پچاس میں بھی ماما کا پتہ نہ ہوتا تھا اور سارا کام گھر والی بیوی کے ذمہ ہوتا تھا۔ جس گھر میں ماما ہوتی بھی تھی وہاں یہ نہ تھا کہ شروع سے آخر اور الف سے ے تک ہر کام ماما کرے، ماما بیوی کو مدد دینے والی تھی ورنہ باورچی خانہ کی تمام دیکھ بھال گھر کی بیوی کرتی تھی۔

رمضان المبارک میں ظہر کی نماز کے بعد دالیں بھگو دی جاتی تھیں، تاکہ تین چار گھنٹے اچھی طرح پانی میں رہ کر ان کی سختی دور ہو جائے۔ اس موقعہ پر شاید بعض عقلمند یہ کہیں کہ بارہ تیرہ گھنٹہ تک بھوکا پیاسا رہنے کے بعد دال جیسی ثقیل چیز کھانے سے بیماری نہ ہوگی تو کیا ہوگا، مگر اُن کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے، کہ ان دالوں میں اس قدر مصالحے ڈالے جاتے تھے جو دال کیا پتھر کو ہضم کر دیں۔

عصر کی نماز سے فراغت پانے کے بعد عورتیں باورچی خانوں میں گھس جاتی تھیں اور غریب سے غریب مسلمان گھر میں بھی روزہ کے افطار کی تیاری ہوتی تھی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا، کہ روزہ کا آخری حصہ جو توڑ کا وقت سمجھا جاتا ہے کام دہندوں میں معلوم بھی نہ ہوتا تھا، اور دوسرا یہ کہ افطار کے وقت مختلف چیزیں سامنے ہوتی تھیں دہی بڑے، دالیں، پھلکیاں۔ قلی بڑے پتّے پالک وغیرہ وغیرہ سب سے پہلے اس افطاری میں ایک حصہ مسجد میں بھیجا جاتا تھا۔ جہاں روزہ دار ساتھ بیٹھ کر روزہ کھولتے تھے اور اس افطاری میں مسجد کے مؤذن اور امام کا حصہ محلہ ہونے کی وجہ سے فرض کے قریب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک لطف اور ہوتا تھا۔ غریبوں کے چھوٹے بچّے سات سات آٹھ آٹھ برس کے آکر مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ وہ بھی چونکہ حقدار تھے۔ تھوڑی تھوڑی سی دال ان کو تقسیم ہوتی تھی، اور اُن کا کام یہ تھا، کہ دال لیتے ہی وہ چیختے اور چلّاتے ہوئے

بھاگیں، اور کہیں۔

"روزہ والی روزہ کھولو"

مرد چلتے پھرتے ادھر سے اُدھر سے اذان کی گھنٹہ کی آواز سُن سکتے تھے، مگر گھر کی بیٹھنے والی غریب عورتوں کو اذان کی خبر کیونکر ہو۔ اُن کے واسطے یہ طریقہ تھا۔

عید کے موقعہ پر لڑکیوں کی خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا۔ چاندرات والے روز ساری رات جاگ کر کاٹتی تھیں۔ ہاتھوں میں مہندی لگاتی تھیں۔ نئی چوڑیاں پہنتی تھیں۔ اچھے اچھے کپڑے اور نئی جوتیوں کی خوشی نیند نہ آنے دیتی تھی۔ صبح اُٹھ کر گھر والی سب سے پہلے پانی گرم کرتی تھی۔ اس کے بعد سویاں تیار ہوتی تھیں۔ پہلے مرد اور لڑکے نہا دھو کپڑے بدل بدلا سویاں کھا پی عیدگاہ جاتے تھے، ان کے بعد لڑکیاں اور عورتیں کپڑے بدلتی تھیں۔ مرد عیدگاہ سے فراغت پا کچوریاں مٹھائی کھلونے وغیرہ لے کر آتے تھے۔ لڑکیاں خوش خوش اپنے کھلونے لیتی تھیں۔ اب اِدھر اُدھر کے حصے آنے شروع ہوتے تھے، اور یہاں سے بھی حصے بھیجے جاتے تھے۔ ملنے جلنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، ان آنے والوں میں برابر کی حیثیت ہی کے اور صرف رشتہ دار اور عزیز ہی نہیں محلے کے غریب غربا بھی ہوتے تھے۔ بن ماں باپ کے بچے بھی ہوتے تھے۔ جن کو "حق ہمسایہ ماں کا جایا" اسی طرح حصہ دیا جاتا تھا۔ جس طرح عزیزوں کو۔

موجودہ عیدیں اور روزے سب کے سامنے ہیں، اُس وقت مشکل ہی سے کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں سے عورتوں کے کلام اللہ پڑھنے کی آواز نہ آتی ہو۔ ایک دو ہر عورت اور ہر لڑکی ضرور پڑھا کرتی تھی۔

عصمت سنہ ۱۹۲۰ء

کارزارِ حیات[1]

مولوی قادر علی صاحب جو مولانا امام بخش صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے، اور انھیں کے ساتھ انھیں کے گھر میں رہتے تھے، ایک موقع پر بیان فرماتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہرپرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آپہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی، اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی، ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا، اور پھانسیوں کی بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے

---

[1] ۲۲ء میں جب حضرت علامہ مغفور وداعِ ظفر الملقب بہ "نوبت پنج روزہ" کے لئے غدر ۵۷ء کے واقعات فراہم فرما رہے تھے تو یہ پرلطف واقعہ بھی قلمبند فرمایا تھا لیکن مسودہ کاغذات میں مل جانے کی وجہ سے وداعِ ظفر میں نہ آسکا اب جو پرانے کاغذات دیکھے گئے تو ان میں مسودہ برآمد ہوا۔ اس لئے اس کتاب میں یہ واقعہ بھی درج کیا جاتا ہے۔ مرتب

اپنی بندوقیں طیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ "موت تمہارے سر پر ہے، گولیاں تمہارے سامنے ہیں، اور دریا تمہاری پشت پر۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں" میں بہت اچھا تیراک تھا، مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ اُن کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لئے دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا، پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا۔ کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ لوگ گر کر مر گئے۔

اس صدمہ نے میری جان پر بنا دی تھی۔ لیکن کچھ کر نہ سکتا تھا، دن دریا میں بسر ہوا۔ جب آفتاب غروب ہوگیا تو ایک جگہ جنگل بیابان میں ٹھہرا اور پانی سے نکل کر خشکی پر آیا۔ چاروں طرف دیکھا کہیں روشنی نظر نہ آئی دن بھر کا بھوکا، اور پانی کی تکان، ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ رات بھر مارا مارا پھرا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں دہلا رہی تھیں۔ لیکن پناہ کی کوئی جگہ نہ ملتی تھی۔ یہاں تک کہ رات رخصت ہوئی؛ اور آفتاب نے اپنے ڈیرے ڈالے، رات کو جانوروں کا خوف تھا۔ اور دن کو آدمیوں کا۔ کہ کوئی پکڑ کر پھر دلی نہ پہنچا دے مجبور پھر پانی میں کودا، اور دن بھر تیرتا رہا۔ بھوک کے مارے انتڑیاں قل اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اڑتالیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے، ابھی جھٹپٹا تھا، کہ میں ایسی جگہ پہنچا جہاں ایک مختصر سا گاؤں آباد تھا۔ لڑکوں نے مجھے دیکھ کر

چیخنا شروع کیا۔ اور ان کے چیخنے سے بہت سے مرد جمع ہو گئے اُنھوں نے چور اور باغی کے نعرے بلند کئے۔ اور حکم دیا کہ باہر نکلو۔

مجھے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، ہر چند چاہا کہ غوطے لگا کر آگے بڑھ جاؤں مگر جب سر نکالتا تھا۔ جب ہی پتھر پڑتا تھا۔ لاچار باہر نکلا، گوجروں نے مجھ کو پکڑ کر پھر دتی لانے کا ارادہ کیا۔ مگر ایک شخص نے اتنی ہمدردی کی کہ صدری کرتہ، پیجامہ اور گٹھڑی (جو صدری میں پڑی تھی) لے کر کہا

"جا پانی میں کود پڑ۔ اور جہاں جی چاہے چلا جا۔"

اُس وقت بھوک کی یہ کیفیت تھی کہ میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ پانی میں کودا، اور آگے بڑھا۔ رات چاندنی تھی، اور میں اس توقع پر پانی میں چلا جا رہا تھا کہ شاید کہیں اور روشنی نظر آئے تو جا کر کھانے کا سوال کروں۔ کہ ایک جگہ سفید انڈا سی قبر نظر آئی یہاں ایک طاق میں چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ میں ٹھیرا کنارہ پر آیا تو دیکھا کہ ایک قبرستان ہے، جہاں سیکڑوں قبریں بنی ہوئی ہیں۔ قبر کے اوپر چراغ کے پاس مٹی کے ایک پیالہ میں خشکہ رکھا ہوا تھا اور اس پر کھانڈ پڑی ہوئی تھی۔ کیا بتاؤں کہ وہ پاؤ سیر کا نوالہ میرے واسطے جنت تھی۔ یا بادشاہت ڈٹ کر کھایا اور سیر ہو کر پانی پیا۔ سامنے گاؤں تھا، اور یہاں مسلمان آباد تھے۔ ان لوگوں نے رات بھر اپنے ہاں ٹھیرایا۔ صبح کو کھانا کھلایا اور اب میں یہاں سے خشکی کا راستہ طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔

مولوی قادر علی صاحب پھرتے پھراتے جودھپور پہنچے، اور وہاں پلٹن میں صوبیدار مقرر ہوئے۔ عرصہ دراز تک زندہ رہے۔ پنشن کے بعد جب دہلی واپس آئے ہیں تو مجھ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ بہت خوبیوں کے آدمی تھے۔ اور غدر کے حالات جس وقت بیان کرتے تھے تو تمام محلہ جمع ہوجاتا تھا۔

افسوس اب ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں۔

شاہی میلہ

یوں تو ہندوستان سدا ہی سے میلوں ٹھیلوں کا گھر رہا، مگر دلی کے بے فکروں نے اس فن کو بھی معراج پر پہونچا دیا۔ برس کے تین سو پینسٹھ دنوں میں دو سو سے اوپر میلے گن لو۔ تھیٹروں کے دروازوں اور چوک کی سیڑھیوں پر جو جمگھٹا رہتا ہے، وہ الگ رہا۔ اِس خیال سے کہ کوئی اٹھواڑہ خالی نہ گذر جائے جمعرات کو پیر غیب ہی پر میلا جما دیا۔ گھر میں فاقہ ہے۔ تو بلا سے۔ اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں تو ان کی تقدیر۔ مگر ان سیلانی جیوڑوں کے میلہ میں فرق نہ آئے۔ لڑ کر جھگڑ کر چھین کر جھپٹ کر کسی نہ کسی طرح آٹھ پیسے کارخاندار سے لیئے۔ منڈے نے برتن تک بنئے کے ہاں پہونچا دیئے اور گھروالی فاقے کرتے کرتے کانٹا ہو گئی، مگر شوقینوں کی وضع میں فرق نہ آیا۔ پھٹی پرانی صدری گلے میں ڈالی اور پرانا چادرہ بغل میں لے نکل کھڑے ہوئے۔ تین نے مل کر یکہ کیا۔ الائچی دار پان پنواڑی سے بنوائے اور گلوری کلے میں دبا یکہ میں بیٹھ چلتے ہوئے۔

رسیتے کی باتیں، الٰہی تیری پناہ، کوئی علم ان سے نہ چھوٹا کوئی تاریخ ان سے

نہ بچی۔

شہنشاہ معظم کی تشریف آوری کے موقعہ پر دلّی نے ایک تحفہ "شاہی میلہ" کے نام سے بھی بارگاہ خسروی میں نذر گذارا، اور لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے دلّی والوں نے دل کھول کر اس میلے کے مزے لوٹے۔

راج گھاٹ کے پاس جہاں جمنا بہہ رہی ہے۔ بیلہ میں یہ میلہ سجایا گیا ایک طرف مینا بازار لگا۔ دُور دُور کے دوکانداروں نے اپنے مال لگائے۔ اور مشہور مشہور صنّاعوں نے اپنی صنعت کے نمونے پیش کیے۔ دوسری طرف مرغ بازی، پتنگ بازی۔ غرض بہت سی بازیوں کے اکھاڑے بندھے۔ دنگل ایسا بندھا۔ کہ اب شاید ایسا کبھی نہ بندھے۔ ہندوستان بھر کے نامی گرامی چوٹی کے پہلوان جو رستم وسہراب ہونے کے مدعی تھے، نبرد آزما ہوئے۔ کئی کئی ہزار روپیہ کے انعام پر کشتیاں ہوئیں۔ مست ہاتھیوں کی لڑائیاں جن کے چرچے سُنتے تو تھے مگر پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا ہم نے بھی دیکھ لیں شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ نے بھی اس میلہ کا ملاحظہ جھروکوں سے فرمایا۔ دن کے وقت چھوٹنے والی آتشبازی سے جس کا نام بھی نہ سُنا تھا دیکھنے والوں کے دل خوش ہو گئے۔ خفتگے کا ایک آوازہ زمین پر دوسرا آسمان پر۔ آوازہ ہوتے ہی جو پھٹا تو رنگ برنگ کے جانور ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ اور طرح طرح کے پھول اِدھر اُدھر تیرتے پھرتے ہیں۔ پہاڑیوں کا ناچ بھی عجب لُطف کی چیز تھی۔ بیچ میں باجا۔ چاروں طرف ناچنے والے گتو بنیر اس مزے سے تھرک رہے تھے

کہ دیکھنے والے پھڑک گئے۔ راج گھاٹ کے مندر، اور شاہ بڑے کی درگاہ پر ہندو مسلمانوں کے پنچھے چڑھے ہے منتخب نفیری والوں نے اپنی دلکش تانوں سے دل مسخّر کر لیئے۔

باوجود روک ٹوک کے خلقت ٹوٹی پڑتی تھی، اور گو کئی میل رقبہ میں میلہ لگا ہوا تھا۔ مگر تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی، دلّی کے بے فکرے تو اس تاک میں تھے ہی، میلہ کا نام سُنتے ہی اُمنڈ پڑے۔ کچھ مرنکل گیا تو بلا سے، مگر ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ پردیسیوں کا تانتا مزید براں۔

میلہ کے ضمن میں بحث دو زردوزوں کی گفتگو سے ہے۔ ان کی میلی کچیلی کام سے لپی ہوئی ٹوپیاں۔ کتنے نکلی ہوئی سپاٹ، اور سلمہ ستارہ کی جوتیاں، کنویز کے اُتّو کیئے ہوئے پُرانے کوٹ، ان کے افلاس کی پوری شہادت دے رہے تھے۔ کام موجود تھا۔ کارخاندار پھیرے کرتے کرتے تھک گیا مگر یہ اپنے فاقوں میں مگن تھے، اور آٹھ دن تک کام پر جانا حرام سمجھتے تھے۔

سلامت۔ "کیوں ہی شیدو! آج تو مزا آ گیا!"

شیدو۔ "مزا؟ میں کہتا ہوں اعمر بھر یہ بات نصیب نہیں ہونے کی! کرخندار کو دیکھو! اِتّی عقل نہیں کہ بے کام تو روز ہی ہے! مگر بادشاہ روز روز کاں!"

سلامت۔ "تو نے بھی یار کس نیستی کا نام لیا، صبوں سے تو روٹی نصیب ہوئی نہیں۔"

"تو نے اس وقت کی بھی کھوائی۔ ابے بھائی یہ دیکھ۔ بادشاہ ہو تو اتنا تو ہو گھی کی طریوں روپیہ بہایا ہے۔ مگر چہرہ پر بل تک کا نہیں۔"

شیدو۔ "سلامت یار ہے تو بھی بوٹگا ہی! روپیہ کو پیٹ رہا ہے! ابے بادشاہ کو روپیہ کی کیا کمی، یہ دیکھ کہ دلّی بادشاہ کا گھر بن گئی۔ چھ مہینے وہاں، چھ مہینے یہاں۔"

سلامت۔ "تشت! کیا اوندھی کھوپری کا آدمی ہے، ابے دلّی تو کردی لاٹھ کے نام۔ اور کلکتہ دیا چھوٹے لاٹھ کو!"

شیدو۔ "واہ بے خبط! کیا سمجھا ہے۔ اُستاد سلو سے تو پوچھو توحید آباد والے کے برتر ہی میں تھے۔ جب حکم پڑھے گئے ہیں! گرمیاں شُرو ہوئی نہیں اور بادشاہ یہاں آیا نہیں!"۔

تمدن ۱۹۱۱ء

لال ڈاڑھی والے مرزا صاحب

آج کی دلی نہیں شہر آبادی کے چاندنی چوک، اور فتح پوری کی سڑکوں کو لال ڈاڑھی والے مرزا صاحب یاد ہوں گے۔ یہ سیتا رام کے بازار میں رہتے تھے۔ اور ایک سُرخ رنگ کے گھوڑے پر سارے شہر کا چکر لگاتے تھے، ستر برس کے قریب عمر تھی، سبز عمامہ سر پر، ہزارہ تسبیح گلے میں اور دو سوا دو گز کا کمر پٹیا بندھا ہوا مقطع صورت نورانی چہرہ، عالم، فاضل، مولوی، واعظ تمام شہر عزت کرتا تھا دماغ میں کچھ فتور آگیا تھا اس لئے جدھر نکل جاتے تھے، لڑکے بالے، اور بعض دفعہ نوجوان بے فکرے گالیاں کھاتے، اور فضیحتیاں سننے کو چھیڑا کرتے تھے۔

مرزا صاحب "ہاتھی آیا" سے چڑا کرتے تھے، جہاں کسی نے کہا "مرزاجی ہاتھی آیا ہاتھی آیا" اور مرزا صاحب نے گھوڑا چھوڑا، اس کا پیچھا لیا۔ سڑک پر لکڑیاں پٹختے اور گالیاں دیتے چلے جارہے ہیں، اور لوگ "ہاتھی آیا ہاتھی آیا" کے نعرے لگا رہے ہیں، پڑھے لکھے آدمی تھے صبح کی نماز پڑھ کر مسجد میں وعظ کہنے بیٹھ گئے، اور مخلوق آپ کی تفسیر کا لطف اُٹھا رہی ہے۔ جھوم رہی ہے۔ کہ دفعۃً طبیعت بگڑ گئی اور برابر والے آدمی کے ایک ایسا تھپڑ دیا کہ بھاگ پڑ گئی، اب مرزا صاحب

لکڑی پھراتے ساری مسجد میں پھر رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں "ملعونوں! میں تمہارے باوا کا نوکر ہوں، کہ میں وعظ کہوں، اور تم سوؤ"

فجر کی نماز سید رفاعی کی مسجد میں پڑھ رہے تھے، آخری رکعت کے سجدے میں برابر والے کی پشت پر چڑھ بیٹھے، اور کہنا شروع کیا "ہڑہ گھوڑے بڑہ، چل بیٹے ٹٹو چل" ایڑیاں مار رہے ہیں، اور تھپڑ لگا رہے ہیں۔ ایک روز گھر سے نکلے گھوڑا ٹھیرا کر پیسے کے بونٹ لئے گھوڑے کو بھی کھلائے، خود بھی کھائے۔

بونٹ کھاتے ہوئے کشمیری مل بزاز کی دوکان پر پہنچے جو موتی بازار کے باہر چاندنی چوک میں تھی وہاں بیٹھ کر کپڑا خریدا حساب کرنے بیٹھے تو ململ کے دام پیسے کے دو سیر لگائے۔ خلقت جمع ہو گئی۔ مرزا صاحب گرج رہے تھے۔ اور فرما رہے تھے، "چار پیسے کی دو سیر ململ"۔ ایک شخص نے کہہ دیا، کہ "مرزا جی ہاتھی آیا" مرزا صاحب سب کچھ بھول گئے، اور اس کے پیچھے لپکے، دن بھر یہی سوانگ رہتا تھا۔

چونکہ خاندانی آدمی تھے۔ اس لئے ہر معقول آدمی عزت کیا کرتا تھا۔

رمضان شریف میں سحری کھا کر گھر سے نکلتے تھے، اور بیوی سے کہہ دیتے تھے "افطار کا سامان ساتھ کر دو نہ معلوم روزہ کہاں کھل جائے"۔ گرمی کا موسم ہے اور مرزا صاحب ٹھیک دوپہر کو چاندنی چوک میں چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رک گئے۔ گھوڑے کو درخت سے باندھا، اور کمر پٹا کھول کر سڑک پر بچھا آوازیں دیں۔

"ارے روزہ والو! روزہ کھول لو"

یہ کہہ کر اذان دی اور افطاری کھول کھانے بیٹھ گئے۔

مولوی وزیر الدین خان مرحوم کے قریبی عزیز تھے عید کے موقعہ پر ایک مرتبہ پتنگ بازی کا ہاتھ لگا۔ شاہ جی کے تالاب پر مقابلہ تھا، مرزا صاحب بھی پہنچ گئے، اپنے ہاتھ سے ادھا بنا کر اڑانے لگے اور فرمایا "لو دیکھو نوشیرواں گڈی اس کو کہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر پیچ لڑانے شروع کئے لوگ مرزا صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے، تو پیچ کاٹ کر گڈی اُتار لی تو معلوم ہوا، کہ ان جیسا قابل آدمی اس فن کا بھی ایسا ماہر ہے!

دریا کی سیر تھی بڑے بڑے تیراک اپنے کمال دکھا رہے تھے، پانی خوب چڑھا ہوا تھا۔ بھنور جگہ جگہ پڑ رہے تھے مرزا صاحب عمامہ اور پاجامے سمیت بھنور میں کود پڑے، سب کو یقین ہو گیا، کہ اب مرزا صاحب اُبھرنے والے نہیں، مگر مرزا نے وہیں چت اور پٹ ایسی لگائی، کہ اُستاد بھی ایمان لے آئے اور خلیفہ حمن دونے تو قسم کھا کر کہا کہ۔

"کھڑی میرے اُستاد سے بھی اچھی لگاتے ہیں"!

ہائے دلی تیری خاک سے کیسے کیسے باکمال اُٹھے، اور اپنے جلوے دکھا کر ختم ہو گئے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

عصمت ۔ ۱۹۳۲ء

بہادر شاہی لال

یوں تو قلعہ معلّٰی کے کبوتر روز صبح و شام شہر کے آسمان پر بل مارتے تھے۔ مگر جمعہ کا تو تمام دن کشتیوں میں صرف ہوتا تھا، کبوتر بادشاہی نہ تھے شہزادوں کے تھے۔ گولے کم، اور نشاورے زیادہ۔ بادشاہ کو پرندوں کا شوق تو ضرور تھا، اور کبوتر بھی پلے ہوئے تھے، مگر اڑان کے نہ تھے، شاہی چڑیا خانے میں زیادہ تر اگن تھے۔ اور یہ ایسے بے نظیر کہ صبح ہوتے ہی جس وقت زمزمہ پردازی کرتے تو ان کی صداؤں سے قلعہ گونج جاتا، اور آواز کلیجوں کے پار ہوتی۔ موسم سرما میں صبح کی نماز موتی مسجد میں جس کا اب شاید دیکھنا بھی آسان نہیں، چھ بجے ہو جاتی تھی۔ بادشاہ سلامت اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر باہر نکلتے تو خاصا اندھیرا ہوتا، اور اس وقت ان اگنوں کی نواسنجی ایسا سماں پیدا کر دیتی، کہ انسان دنگ رہ جاتے۔
طلوع آفتاب کے بعد جب صحرائی پرند فکر معاش میں مشغول ہو جاتے اور قلعہ معلّٰی کی فضا ان کی بولیوں سے صاف ہو جاتی، اور اگنوں کے واسطے دوسرے پرندوں کی بولی سیکھنے کا موقعہ نہ رہتا تو بستیاں کھول دی جاتیں

اور دانہ پانی دے دیا جاتا۔ چڑیا خانے میں چار پانچ بنگالہ کی مینائیں بھی تھیں جن کے چکناؤ میں روزانہ چار گردے، اور بھنے ہوئے چنے ضرور ہوتے تھے ان کو اگر ایک دن بھی گردوں کا چکناؤ نہ ملتا تو یہ داروغہ کی جان کھا جاتیں، اور دانہ میں منہ نہ ڈالتیں، ان کی لڑائی مشہور تھی۔ جب کبھی جہاں پناہ کا دل چاہتا، کہ آج داروغہ شیر خان، اور میناؤں کی لڑائی دیکھیں گے، تو حکم دیدیتے کہ آج گردے نہ دینا۔ ٹھیک چار بجے میناؤں کو دانہ ملتا تھا، عصر سے فارغ ہو کر جہاں پناہ چڑیا خانہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا، کہ مینائیں داروغہ کی جان کو آرہی ہیں، کچھ دیر لطف اُٹھایا، اور حکم دیا۔

"اچھا بھئی داروغہ جی ان کو ناشتہ دے دو"

ایک جوڑا پہاڑی کوکلوں کا بھی تھا، شاہی حکم سے داروغہ نے ہزاروں جتن کئے کہ ان کے بچے پیدا ہو جائیں۔ مگر اس جوڑے نے کبھی انڈے ہی نہیں دیئے ان دونوں سے بادشاہ کو اس قدر محبت تھی، کہ جب مادہ مر گئی، اور نر نے کھانا پینا چھوڑ دیا، تو داروغہ کو حکم دیا، کہ جب تک دوسری مادہ نہ آجائے تو تم پھیکی روٹی پیٹ بھرنے کو کھا لینا سالن نہ کھانا۔

ایک روز صبح کے وقت ایک بھیلیا حاضر ہوا اور داروغہ سے کہا۔

"جہاں پناہ تک پہونچا دو"

اس کے پاس بیسیوں قسم کی چڑیاں خوبصورت اور رنگ برنگ کی تھیں، وہ باریاب ہوا تو اس کے پاس ان چڑیوں کے ساتھ دو طوطے بھی تھے جن کے پروں پر چھ رنگ تھے۔ یہ چڑیا سے بھی کچھ چھوٹے تھے۔ ان کو دیکھ کر بادشاہ۔ اور

اراکین دربار بہت خوش ہوئے، مگر جہاں پناہ کی زبان سے نکلا۔

"طوطا بے وفا جانور ہے۔"

بھیلئے نے عرض کیا۔

"جہاں پناہ جانور تو سب ہی بے وفا ہوتے ہیں۔" بادشاہ نے فرمایا "نہیں تو ٹھیک نہیں کہتا۔" یہ فرما کر داروغہ سے کہا "ذرا اپنے کبوتر تو لاؤ۔"

کبوتر لائے اور اُڑائے اور بلائے گئے۔ آئے، اُڑے، اور اُترے۔

جہاں پناہ نے بھیلئے سے فرمایا "اب کہو"

بھیلئے نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

"سرکار کبوتروں کا ذکر نہیں ہے"۔ داروغہ کو حکم دیا "شیر خان اس کو کچھ اور تماشہ دکھاؤ، اُسی وقت تعمیل ہوئی۔ دو ڈھائی سو لال اور پدڑیاں آگئیں۔ داروغہ نے کبوتروں کی طرح اُن کو اُڑایا۔ اور ایک آواز پہ سب کو بلا کر جمع کر لیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے، اور بھیلئے سے کہا۔

"اب کیا کہتے ہو۔"

بھیلیا کان پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور عرض کیا۔

"جہاں پناہ ان جنگلی جانوروں کا سدھانا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ تو بادشاہ ہی سدھا سکتے ہیں۔"

دلی والی اماں

دِلی کی خاک سے جو باکمال اُٹھے، اور جن کی زندگی کو وقت نے سر آنکھوں پہ جگہ دی، وہ آج وطن کی خاک میں آرام کر رہے ہیں۔ یہ گو ابدی نیند سو چکے، مگر شہرت اس وقت بھی ان کے نام کا ڈنکا بجا رہی ہے، ان میں مرد بھی تھے، اور عورتیں بھی۔ لیکن اس مجلس میں مرد ہی مرد نظر آ رہے ہیں۔ عورتوں کا کہیں نشان نہیں۔ پیاری بچیوں، پردے کے پیچھے دیکھو، تمہاری بزرگ نانی، دادیوں کا گروہ مردوں سے بڑھ چڑھ کر کام کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ ان کے جگمگاتے چہرے، اور نورانی صورتیں تم کو بتائیں گی، کہ اس صدی کی ابتدا میں اسلامی معاشرت کیسے کیسے پھولوں سے مہک رہی ہے۔ مسلمان لڑکیاں اپنے بہت سے جواہر گنوا چکیں۔ مگر ابھی وقت ہے کہ قدامت کے اس چمن سے جہاں میں بتاتی بچیوں کو لے جا رہا ہوں، وہ کچھ پھول چن لیں، لیکن وہ پھول جن میں رنگ کے ساتھ بو بھی ہو۔ اور برابر کے بیٹھنے والے کو بھی مہکا دیں۔ وہ نہیں جو صرف مانگ کو سجاویں۔

پیاری بچیوں، غور سے دیکھنا، یہ اس وقت کی دھندلی سی تصویریں ہیں

جس کو آج کی دُنیا دورِ جہالت بتا رہی ہے۔ کچھ شک نہیں، کہ موجودہ علوم سے محروم ہیں۔ لیکن ان کے سینے کلام الٰہی سے آراستہ اور ان کی زندگیاں ہمدردی میں ڈوب رہی ہیں احکام الٰہی اور ارشاد نبویؐ کے دریا ان کی زبانوں سے جاری ہیں، اور یہ وہ ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گی،

لو بچیوں دیکھو غدر ۵۷ء کو دس سال سے زیادہ ہو گئے۔ سونے چھونے والیاں خاک میں مل چکیں۔ جن گھروں پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں گدھوں کے ہل پھر گئے تخت و تاج کے مدعی دو دو دانوں کو محتاج پھر رہے ہیں۔ پہاڑ گنج کے پاس قاری امید علی کی گلی میں جس کا آج نام و نشان بھی نہیں۔ محمدی بیگم اور ان کے شوہر شہزادہ سلطان مرزا رہتے ہیں محمدی بیگم بادشاہ کی قریبی عزیز ہیں، اور اکیاون روپے کے قریب سرکار سے ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ دونوں میاں بیوی اطمینان سے گذارہ کر رہے ہیں۔

گو غدر کی مصیبتیں بہت کچھ کم ہو گئیں ہیں، مگر ایک ایسا انقلاب پیدا ہو گیا ہے، جو انسانی آنکھوں نے اس سے پہلے بہت ہی کم دیکھا ہو گا۔ شہزادے اور شہزادیاں بھیک مانگتے پھر رہے ہیں اور روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے ساتھ جہاں آباد کے اور شرفاء بھی شامل ہیں جو غدر کے مارے ہیں، کل راج کر رہے تھے، اور آج ٹکڑے کو محتاج ہیں۔

محمدی بیگم مرحومہ اور اُن کے شوہر، شہزادے نہیں فقیر تھے، اور صرف اس لئے زندہ تھے، کہ خلق اللہ کی خدمت کریں۔ میرے جدّ امجد کی شاگرد تھیں۔ اور ہر جمعہ کو وعظ فرماتی تھیں، ایک جمعرات کو مجھے اُن کے ہاں سونا کا

اتفاق ہوا۔ اس وقت میری عمروس گیارہ سال کی ہوگی۔

میں آج بھی تمنا رکھتا ہوں، کہ یہ رات زندگی میں ایک دفعہ اور دیکھ لوں اور صحبت شب کا لطف اُٹھاؤں، مگر وہ رات دوبارہ نصیب نہ ہوئی، اور نہ امید ہے، کہ وہ مکھڑے اب دکھائی دیں گے۔ اور ان پھولوں کی خوشبو سے اب دماغ معطر ہوگا۔

مغرب کے بعد دسترخوان بچھا اس وقت کے پچاس آج کے پانچ سو سے زیادہ تھے۔ کھانا معمولی تھا۔ دال سالن اور روٹی مگر دسترخوان پر پندرہ بیس آدمیوں سے کم نہ ہوں گے۔ ان میں محلہ کے اکثر غریب تھے۔ رانڈیں تھیں یتیم تھے، اور ایک مفلوج بھی۔

محمدی بیگم مرحومہ کے ہاں کوئی ماما نہ تھی، وہ خود پکاتی تھیں، اور جس وقت لوگ کھانا کھاتے تھے اپنے ہاتھ سے گرم گرم روٹی پکاتی، اور کھلاتی تھیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد محمدی بیگم نے خود کھانا نہیں کھایا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت، اور اس کا چھ سات برس کا بچہ آئے۔ یتیم بچّہ اور اس کی ماں کھانا کھاتے، اور دعائیں دیتے جاتے تھے۔

اب محمدی بیگم خود کھانا کھانے بیٹھیں۔ ایک معمولی سی رکابی میں روٹیاں اور دال تھی، کھا ہی رہی تھیں، کہ ایک عورت گھبرائی ہوئی آئی، اور کہنے لگی۔

"امّاں بچّہ کسی عنوان نہیں ہوتا۔" پیسہ پاس نہیں، دائی کو کہاں سے بلاؤں۔ ذرا چلی چلیئے۔ بچی تڑپ رہی ہے۔"

اتنا سنتے ہی محمدی بیگم، روٹی چھوڑ برقع سر پر ڈال، اس کے ساتھ ہولیں

اور گھنٹہ سوا گھنٹہ میں ہنستی ہوئی آئیں، اور فرمانے لگیں "مولوی صاحب امداد کے ہاں لڑکا ہوا۔ کم بخت رانڈ ہے۔ اب میں ان بچاریوں کے واسطے دائی بھی بن جاتی ہوں۔"

عشا کے بعد دونوں میاں بیوی، اور مولوی صاحب باتیں کر رہے تھے۔ اور بحث کلام اللہ کی کسی آیت پر تھی خدا معلوم میری نیند اس روز کیوں اُڑ گئی تھی۔ بارہ یا ایک بجا ہو گا، اور یہ سب باتوں میں مصروف تھے، کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی اس کی گود میں بچہ تھا۔

اس نے دروازہ ہی میں سے چیخ کر کہا "دان والی اماں دیکھئے تو سہی بچہ کو دورہ پر دورہ اُٹھ رہا ہے"۔ محمدی بیگم مرحومہ نے بچہ کو غور سے دیکھا، اور چمچہ میں ایک گولی گھول کر دی تھوڑی دیر بعد دورے موقوف ہو گئے، اور عورت ہنستی ہوئی چلی گئی۔

محمدی بیگم اپنی تنخواہ میں سے دس روپیہ ماہوار جمع کرتی تھیں، اور جب محلہ میں کسی لڑکی کا نکاح ہوتا تھا، تو پانچ برتن اور تین جوڑے دُلہن کو دیتی تھیں اس واسطے وہ دان والی امّاں کے نام سے مشہور تھیں۔

اصلی بہار گنج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ مگر آج بھی جب وہ محلہ اُجڑ گیا اور وہ لوگ فنا ہو چکے "دان والی امّاں" کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے، اور ہمیشہ ہو گا۔

بنات ۔ سنہ ۱۹۳۳ء

جہاں آباد کا اُجڑا ہوا سماں

دِلّی کی جو بہاریں دِلّی والوں کے ساتھ اُجڑیں، اُن میں ایک پیرِ غیب کا میلہ بھی تھا جسے دِلّی نے غدر کے بعد برسوں منایا ہے۔ ہر جمعرات کو چار بجے سے لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور اہل فن اپنے اپنے کمال دکھا کر داد لیتے تھے۔ جمنا سامنے تھی۔ جس کے کنارے پر دُور تک، دریاں، چاندنیاں، جاجمیں، غالیچے، بچھ جاتے تھے، اور شہر والوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں، چاروں طرف زندگی کا لطف اُٹھاتی پھرتی تھیں۔ کہیں طبلہ اور ستار کھڑک، اور بج رہا ہے۔ کہیں کُشتیاں ہو رہی ہیں، کسی جگہ پیچ لڑ رہے ہیں، اور کسی جگہ مداری تماشے دکھا رہے ہیں، کہیں کُدائی ہو رہی ہے۔ کوئی ملاحی ہاتھ مار رہا ہے۔ کوئی کھڑی لگا رہا ہے، کسی نے چت لگائی، اور کسی نے پٹ۔ غرض خلیفہ رحمون کے اشارے پر یہ پانی کی پتلیاں دریا میں ناچتی پھر رہی ہیں، آج اگر یہ چیز معیوب نہ سمجھی جائے تو کہہ دوں، کہ حکیم عبد المجید خاں جو امیر الدین نیولے اور اسمٰعیل انچھو کے عاشق تھے، کبڈی میں کھڑے، اور اکھاڑے میں بیٹھے حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، اور ہر طرف سے واہ واہ ہو رہی ہے، درگاہ کے مشرقی

حصّہ میں سودے والوں کی دُکانیں ہیں، حافظ کبابی کی دُکان پر ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہوا ہے۔ پسندوں کی سیخیں کوئلوں پر دھری ہوئی ہیں، ایک طرف پیاز اور ادرک کے لچھے ہیں، دوسری طرف کیری اور ہرے دھنیے کی چٹنی۔ برابر میں منبتؔ کی دُکان کے روٹے اور میدے کے پراٹھے ہیں، اتّو، اور سلیم کی مشکیں پچکوئیوں کے پانی سے بھری ہوئیں ہیں، اور کٹوروں کی جھنکار موسیقی میں ڈوبی ہوئی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔

سنہ ۸۲ عیسوی ختم کے قریب ہے، بادشاہ کے انتقال کو بیس سال ہو چکے مگر وقت پوری طاقت سے دِلّی والوں کے جذبات کا مقابلہ کر رہا ہے ابھی ان کا حسن عقیدت فنا نہیں ہوا، وہ شادی اور غمی کے موقعوں پر اپنے بادشاہ کو یاد کر لیتے ہیں، اور گو مفارقت ابدی کی لوریاں تھپک تھپک کر آنکھیں بند کر چکیں، مگر دل کے داغ ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں رونما ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ابھی ترقی کا دور شروع نہ ہوا، تعلیم عام نہ ہوئی تھی قریب قریب سب جاہل تھے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ درگاہ سے نکلتے ہوئے چبوترے سے مغرب کی اذان جنگل بیابان میں گونجتی۔ آج سنہ ۱۹۳۳ء میں جب مسلمان ترقی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ ایڈورڈ پارک میں کبھی کبھی مغرب کی اذان علوم جدیدہ کی تفسیر کرتی ہے۔ یہ پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔ احمد سعید خان، حکیم عبد المجید خان شہزادہ سلیمان جاہ جیسے چوٹی کے رئیس نماز میں شریک تھے۔ فراغت ہوئی تو درود کے بعد مختصر سا ختم ہوا، اور بادشاہ کی مغفرت کے لئے دعا مانگی گئی، اس وقت کوئی ایسی بات نہ تھی، جو دلوں کو متاثر کر دیتی مگر مشکل ہی سے کوئی

ایسا سنگ دل ہوگا، جس کی آنکھوں سے آنسو نہ جاری ہوں۔

رات چاندنی بھی نہ تھی، اور بجلی کے قمقمے بھی نہ تھے، مگر روشنی نے ہر سمت آگ لگا دی تھی۔ عشا کے بعد گانا شروع ہوا۔ دِلّی کی اچھی سے اچھی گانے والیاں، اور گانے والے سمٹ سمٹا کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ گیارہ بجے تک چہل پہل رہی، اور پھر چھیڑ ہونی شروع ہوئی۔

خاندان شاہی کی مشہور بیگم مبارک زمانی جن کی جوانی قلعہ کی رنگ رلیوں کی سرتاج تھی، اب بڑھاپے میں ہڈیوں کی مالا تھیں۔ مگر آواز میں اب بھی ایسا کڑا کا تھا کہ رستہ چلتے ٹھٹک جاتے تھے۔ گیارہ بجے کے بعد جب خلقت کا بڑا حصّہ جا چکا تھا، دریا کنارے سے یہ صدا بلند ہوئی۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

آناً فاناً سارے پیرِ غیب میں ڈنکا بج گیا کہ مبارک زمانی بادشاہ کی غزل گا رہی ہیں۔ سجا سجایا میلا چٹکی بجاتے میں وہاں پہنچ گیا، مبارک زمانی کے بال بگلہ ہو چکے تھے۔ اور موت بڑھاپے کے آغوش میں سر پر منڈلا رہی تھی۔ لیکن آواز ایک قیامت تھی، جو کنارِ جمن پر بپا ہو گئی۔ اور دِلّی والوں نے ایسا کہرام مچایا، کہ دریا اور جنگل بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ایک بجلی تھی جو دل پر چمک رہی تھی۔ ایک آگ تھی جو سینہ میں لگی ہوئی تھی، اور ایک برچھی تھی جو جگر کے پار ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب مبارک زمانی نے اپنی غزل ختم کی۔ اور آخری مرتبہ رو کر اسی مصرعہ پر مجلس فنا ہوئی۔

"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دُکان اپنی بڑھا گئے"

آج بھی جب وہ سماں یاد آتا ہے تو دل پر جو کچھ گذر جاتی ہے۔ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا

کیا سے کیا ہو گیا

تباہی بغداد پر شیخ نے اپنے مرثیہ میں ایک جگہ فرمایا ہے، کہ اگر آسمان زمین پر خون کے آنسو گرائے تو درست ہے۔ بغداد شہروں کی دُلہن مشہور تھا اس کے باغات، اور عمارتیں اس کی رونق، اور چہل پہل ھارون اور مامون کے عہد میں جنّت کا نمونہ تھے، مگر چشم زدن میں اس دُلہن کا سہاگ ایسا اُجڑا کہ قصر زیبا ڈھنڈار ہوا، اور عالیشان محلوں میں گدستے کے پھول بکھر گئے۔

ایک بغداد کیا، نہ معلوم بغداد جیسے کتنے شہر تباہ، اور کتنی قومیں ان واقعات کو فراموش کرتی ہوئی ایسی تاراج ہوئیں، کہ آج صرف اُن کے نام زندہ ہیں دنیا، اور دُنیا کی تاریخ ان خونین حوادث سے لبریز ہے۔ اور بآواز بلند کہہ رہی ہے:

بیک ساعت، بیک لمحہ، بیک دَم
دِگرگوں، مے شود، احوال عالم

یہ انقلاب اجتماعی، اور انفرادی، دونوں زندگیوں میں ہوتا ہے، جس طرح قومیں بنتی، اور بگڑتی ہیں۔ اسی طرح خاندان بھی، اور خاندان کے افراد بھی، دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تماشے قریب قریب ہر مرد

اور عورت نے دیکھے ہوں گے، کہ کل جو راج کر رہے تھے، آج دو دو دانوں کو محتاج ہیں، غدر کے دس بارہ سال بعد جب میرا زمانہ طفولیت ختم ہو رہا تھا جمعرات کو ایک بڈھا پھونس فقیر رات کے وقت آتا تھا۔ یہ شاہجہان آباد کے آخری تاجدار بہادر شاہ کا قریبی عزیز تھا۔ میرے جدّامجد اس سے اچھی طرح واقف تھے، اور عزت کے ساتھ اس کو کھانا کھلاتے تھے۔ میں نے اس شخص کو کئی مرتبہ خاموش بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ گو افلاس، اور ضعیفی نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی، لیکن جوانی کے خد و خال بڑھاپے کی جھرّیوں میں ابدی نیند سو رہے تھے، اور بآواز بلند پڑھ رہے تھے۔

تغیر آگیا نقش و نگار حسن میں یکسر
نہ چشم سرمگیں باقی نہ وہ رنگ حنا باقی

یہ غدر کے بعد کا ابتدائی دور تھا۔ شاہی خاندان کی عورتیں، اور مرد بدتر سے بدتر حالت میں گھر گھر مارے مارے پھرتے تھے، اور چشم بینا شب و روز ایسی عبرت انگیز کیفیتیں دیکھتی تھی، کہ خدا دشمن کو نہ دکھائے فراش خانہ کے قریب تھور خان کی مسجد شہر کی ایک مشہور مسجد ہے۔ اس کے پاس ایک چھتہ تھا۔ جو خبر نہیں، اب موجود ہے، یا نہیں۔ اس میں رحمت اللہ قصائی کی دوکان تھی، اس کے پاس اتو بیگ چابک سوار کا گھر تھا، جن کی لڑکی ھرمزی بیگم دلّی کے مشہور پہلوان تفضّل کو بیاہی ہوئی تھیں۔ ھرمزی بیگم کے برابر خجستہ بیگم شہزادی کا گھر تھا۔ ان کی عمر ختم کے قریب تو نہ تھی، مگر بڑھاپے کی گھٹائیں چھا چکی تھیں۔ پردہ شہزادیوں میں بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ مجھے جہاں تک

یاد ہے یہ بیوہ تھیں، اور ان کی بسر اوقات صرف اس پر تھی، کہ وہ شادی بیاہوں کی محفلوں میں کہانی سُنانی تھیں۔ یہ سَرُون کی کہانی جس سے فرایزر صاحب کے تعلقات مشہور ہیں، ایسے مزے سے سُناتی اور گاتی تھیں، کہ سُننے والے دنگ رہ جاتے تھے، جب ان سے کہا جاتا تھا، تو غدر کی اپنی بپتی بھی سُناتیں اور کچھ ایسے درد سے بیچ میں اشعار کا استعمال کرتی تھیں، کہ لوگوں کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ مجھے بھی کئی دفعہ ان کی آپ بیتی سُننے کا اتفاق ہوا۔

کہتی تھیں "مردوں کی کمائی کی قدر ہم کو غدر میں ہوئی ہے۔ قلعہ میں جو اللے تللے کئے ہیں، وہ بڑے دادا جان کو بھی شاید ہی نصیب ہوئے ہوں، کسی طرح کا فکر کبھی پاس آکر پھٹکا ہی نہیں رات دن گلچھرّے اُڑاتے تھے۔ بے فکریاں تھیں۔ رنگ رلیاں تھیں۔ یہ لال قلعہ جس میں ننگ سر سے بسر رہے تھے۔ برابر سے نکل جائیں تو چرٹ کی بُو سے دماغ پھٹ جائے کبھی جنّت بنا ہوا تھا۔ گجردم ادہر توگو انداز نے توپ چھوڑی اُدہر بچّے اور بڈھے کیا مرد کیا عورت سب کلمے پڑھ بچھونوں پر سے اُٹھ بیٹھے۔ کمرے ہیں کہ گلاب گندی کی دوکان بنے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سے عطر کی لپٹیں چلی آرہی ہیں باہر نکلو تو۔

چمن آتش گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

نینوں کے کرتے کچی چکن کے دوپٹّے، موتیا، اور چنبلی میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں میں گجرے، کانوں میں گجراتی موتیا، گلے میں کنٹھے، جوڑوں میں

مولسری۔

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول
پڑے جا بجا مولسریوں کے پھول

سوسو برس کی کئی بڑھیاں، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، چوتھی کی دُلہن بنی ہوئی تھیں۔ لب جو پھڑ جے، تو ایک طرف تو پچیسی، شطرنج، گنجفہ تاش۔ چوسر۔ دوسری طرف ستار، طبلہ، بین، جلترنگ۔ بانسری خبر بھی نہیں ہوتی تھی، کہ صبح کدھر آئی اور کدھر گئی، دن بھر اُچھلنا کودنا اور رات بھر ہنسی قہقہے، اس وقت بھی بہت سی کلجبیاں بھر منہ کوستی تھیں، اور رات دن کوستی تھیں خبر نہیں کس ناشدنی، نامراد کی ٹوک قلعہ کو کھا گئی، کہ وہ ساری بہار دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑ گئی۔

"پتھر کو بھی کھا جاتی ہے، تاثیر نظر کی"

دِلّی لیسے کا ذکر ہے، خالہ سروری سلطان کا بھولا ہوا۔ ساون کا مہینہ تھا اور دو دن پہلے ہی سے قطب صاحب کے اندھیری باغ میں جھولے پڑ گئے تھے۔ اندھیری باغ تھا تو یہی، مگر اُس وقت کا باغ سچ مچ کا باغ تھا جہاں رستہ چلتوں کے سر پر چمپا اور مولسری کے پھول جھکتے تھے۔ آموں کے جھنڈ، اور اُودی اُودی جامنوں پر سبز طوطے اور اُن کے لال لال کنٹھ۔ ایسا گنگا جمنی سماں۔ اب کیا خاک دیکھنے میں آئے گا۔ صبح چار ہی بجے سے مہمان پہونچ گئے۔ اللہ کی رحمت بھی ایسی ہوئی کہ سبحان اللہ یا تین دن سے آسمان تانا ہو رہا تھا یا آدھی رات ہی سے جو سہا گنی گھٹائیں کالی کالی،

اور بھوری بھوری، اُٹھنی شروع ہوئی ہیں، تو دن بھر میں جل تھل کر دیا۔ دوپہر کے بعد ذرا ہلکا ہوا، اور پھوار پڑی، تو شرابور لڑکیوں، بالیوں نے کڑہائیاں چڑہائیں پھوپی آمنہ کی پھُلکیاں، چچی شہزادی بیگم کے قلمی بڑے خالہ جان کے گلگلے، اور چھوٹی سلطانہ کے اندرسے۔

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

دن بھر جو مزے رہے ہیں، آنکھیں مرتے مرتے بھی ان کو نہیں بھول سکتیں، جھولے اب بھی ہوتے ہیں، مگر اب جھولوں کا نام لینا ہمارے جھولوں کی ہنسی اُڑانی ہے۔ صبوری خانم نے جو ملہار گائے ہیں، اور اُس کی آواز گونجی ہے۔ وہ کوئی کیا سُنے گا!!

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

عصمت ۱۹۳۵ء

ساٹھ برس پہلے

ساون کا مہینہ ہے۔ آٹھ دس دن سے جھڑی لگی ہوئی ہے۔ کالی کالی گھٹائیں پورب، اور پچھم سے اُمنڈ گھمنڈ کر آ، اور برس رہی ہیں۔ میرے جدِامجد مولوی عبدالقادر صاحب گھر کے مُنڈھ ہیں۔ لڑکی بالیوں میں مولوی نذیر احمد صاحب کی بیوی ہیں۔ ان کی لڑکیاں ہیں۔ مولوی عبدالغفار صاحب خیری کی والدہ ہیں۔ میری والدہ ہیں۔ حافظہ ام عطیہ ہیں، مولوی اشرف حسین مرحوم کی والدہ ہیں۔ مردوں میں، مولوی عبدالقادر صاحب کے علاوہ ان کے برادر نسبتی ہیں جو پولس میں سپاہی تھے، اور گھر بھر اُنہیں "ماموں مغل" کہتا تھا۔ مولوی عبدالقادر صاحب باوجود علم و فضل۔ ثقاہت، اور سنجیدگی کے نہایت زندہ دل بزرگ تھے۔ اور لڑکیوں کی بہت زیادہ دلداری کرتے تھے۔ بہو بیٹیوں نے مولوی صاحب کی بیوی پر زور ڈالا، اور اُنھوں نے مولوی صاحب سے کہا۔ کہ

"آج لڑکیاں کہہ رہی تھیں، کہ ھمایوں کا مقبرہ ہی دکھا دیجئے بہت دن ہوگئے" بیوی نے میاں سے کہا اور شام کو یہ اعلان ہوگیا، کہ صبح مقبرے چلنا ہے۔

موٹریں اور تانگے اس وقت کہاں۔ بیلوں کی گاڑیاں جو بھارکس کہلاتی تھیں، کام میں آتی تھیں۔ جس میں بچوں کے واسطے آگے ساپنچی، اور پیچھے ماچی ہوتی تھی۔ میری عمر دس سال کے قریب ہوگی۔ خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کیا اچھا وقت تھا۔ مینھ دھائیں دھائیں پڑ رہا ہے، اور عورتیں کھانے پینے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ کوئی آم باندھ رہی ہے کوئی بیسنی روٹی پکا رہی ہے۔ کوئی سرکہ اور پیاز کی چٹنی تیار کر رہی ہے۔ اور کوئی اپنے دودھ پیتے بچے کو گھرک رہی ہے، جو اتفاق سے جاگ اٹھا ہے۔

ماموں مغل چیخ رہے ہیں کہ۔

"اذان ہونے والی ہے۔ جلدی کرو نمازیں پڑھ لو، نہیں تو پھر شکار نہیں ملے گا"

ماؤں نے ہوشیار بچوں کو کپڑے پہنائے، اور سواریاں بیٹھنی شروع ہوئیں۔ ایک بھارکس آٹھ دس سواریاں۔ دس بارہ بچے۔ ایک کے اوپر ایک۔ جب سب بیٹھ گئے تو بھارکس روانہ ہوئی۔ شہر کی فصیل سے نکل کر تین چار بیویاں اتر گئیں کچھ دور پیدل چلیں پھر بیٹھ گئیں، اور دوسری اتریں۔ نیچے اترنے والیاں جن کے ساتھ محلے کے بھی غریب غربا ہیں برسات کے گیت گا رہی ہیں۔ مولوی صاحب، اور ماموں مغل پیچھے ہیں۔ سڑک والی عورتیں لہک رہی ہیں اور گاڑی والیاں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔

ہمایوں کا مقبرہ آگیا۔ ماموں مغل نے جھولا پہلے ہی ڈلوا دیا تھا۔ پانچ چار جھولے کو لپٹیں باقیوں نے کڑاہی چڑھائی۔ پاپڑ۔ قتلی بڑے۔ سہال۔ پھلکیاں، گرم گرم اتر رہی ہیں، اور جھولے والیاں زور شور سے لہک لہک کر

ملہار گا رہی ہیں۔

سبحان اللہ! کیسی پر لطف صبح ہے۔ جھولوں میں لال سبز پٹریاں پڑی ہوئی ہیں، اور میری پھوپی زاد بھاوج پندرہ روز کی دلہن ہلکا سا گھونگھٹ نکالے جھولا جھول رہی ہیں، اور مقابل کے جھولے میں نند بیٹھی ہوئی ہے۔ نند بھاوجیں جھول رہی ہیں، اور بی جمّن اس طرح جھلا رہی ہیں۔

"سکھی! آئے بدروا جھوم کے"
میرے سنگ کی سہیلیاں، پہنچیاں
اللہ میں بھی تو پہنچوں لاج سے

یہ گیت برسات کا ہے، جس کی ابتدا حضرت امیر خسروؒ نے ان الفاظ سے کی ہے۔

"سکھی! آئے بدروا جھوم کے"

یہ معمولی گیت کنواری لڑکیوں کے واسطے ہے، اور عشق و محبت سے بچایا گیا ہے۔ حضرت امیر کا خیال منزل توحید میں تصوف کے پروں سے، اس قدر تیز اڑا ہے، کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

کیسی معقول بات کہی ہے۔

میرے سنگ کی سہیلیاں، پہنچیاں
اللہ میں بھی تو پہنچوں، لاج سے

مطلب صاف ہے۔ لڑکیوں کے واسطے "لاج" کا لفظ اس مضمون میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

اس کے بعد دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔

"وہ دور دراں سے آئیں نندن پاؤں پی"

افسوس یہ ہے، کہ یہ معاشرت ختم ہو چکی، اب رونا اس کا ہے۔ کہ اس خاتمہ کے ماتم کرنے والے بھی نہ رہے۔ ایک نند ساون کے مہینہ میں بھاوج کے پاس جھولا جھولنے آتی ہے، اور بھائی اس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتا۔ بھاوج کس قدر ہمدردانہ الفاظ میں شوہر کو اس کی محبت پر متوجہ کر رہی ہے، کہ نند دور سے پیدل آتی ہے!

وہ سماں بدل چکا، اور اسلامی معاشرت کے چمنستان سے تعلقات کے یہ پھول ٹوٹ چکے، اور آج جبکہ ترقی کا دور دورہ ہے برسوں بھی نند بھاوجیں ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتیں۔

دن ختم ہوا۔ بچے باغ باغ تھے۔ عورتیں نہال نہال۔ کنیر کے زرد زرد پھولوں سے گودیں بھر بھر واپس ہو رہے ہیں۔

ماموں مغل خدا اُن کو غریق رحمت کرے بچارے سپاہی تھے جن کو عمر بھر بھی بندوق چھوڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ان کا ایک لطیفہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میری چچی صاحب سے جن کے شوہر اس وقت تحصیلدار تھے۔ فرمانے لگے۔

بھئی حمید الزمانی، شکار تو رہ گیا۔ خیر گھر چل کر پکا لینا۔ میں اب مار دیتا ہوں"
یہ فرما کر بھر کس والے کو حکم دیا، روک لے۔ گاڑی ٹھہر گئی۔ ایک
چھوٹے سے درخت پر فاختہ بیٹھی تھی۔ بچے، اور عورتیں سب منتظر
تھے، اور ادھر ہی نگاہ تھی، کہ ماموں مغل نے بندوق کی نالی فاختہ
کی دُم سے ملا دی، اور فیر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ فاختہ اُڑ گئی، اور ماموں مغل
گر پڑے۔ اور یہ کہتے ہوئے اُٹھے۔

"خیر میرے بازو میں تو جھٹکا آیا ہی ہے، مگر فاختہ بھی بُری طرح زخمی
ہوئی ہے"۔

اللہ، اللہ کتنے: اچھے، اور سیدھے سادے لوگ تھے، کہ آج آنکھیں
ان کو ڈھونڈ رہی ہیں، مگر وہ بھولی بھالی صورتیں نظر نہیں آتیں۔

عصمت ستمبر ۱۹۳۵ء

نغمۂ ناتمام

حضرت والد مغفور کا سب سے آخری مضمون تو وہ ہے جو دسمبر کے عصمت کے لئے "روزہ" کے عنوان سے ۲۲ یا ۲۳ نومبر کو علالت کے پہلے ہفتہ میں آمنہ نازلی سے لکھوایا تھا، مگر اپنے دست مبارک سے جو مضمون ۱۸ یا ۱۹ نومبر کو، بیمار پڑنے سے دو روز قبل لکھنا شروع کیا تھا اُن کے مخصوص رنگ کا آخری اور نامکمل مضمون ہے جسے بعد حسرت و یاس درج ذیل کرتا ہوں ۱۲ دسمبر کی شب کو جب میں نے یہ عرض کیا تھا کہ "صبح ڈاکٹر انصاری آپ کو دیکھنے آرہے ہیں تو دوران گفتگو میں اس مضمون کا یوں ذکر فرمایا تھا۔

حکیم محمود خان اور مولوی نذیر احمد کی ایک ملاقات کا حال لکھنا شروع کیا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔ محمود خان جیسا طبیب اب کیا پیدا ہو گا مگر نذیر احمد بھی بے مثل ادیب تھے۔ وہ اپنے فن کے یکتا تھے تو یہ اپنے رنگ میں بے مثل۔ حکیم صاحب نے مولوی نذیر احمد کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی مولوی نذیر احمد کو یہ بات ناگوار گذری حکیم صاحب اور سارا مطب دیکھتا کا دیکھتا رہا اور مولوی نذیر احمد یہ جا وہ جا۔

حضرت علامہ مغفور کے سامنے علوم و فنون کی مجلسیں سُونی اور مشرقی خوبیوں سے بھری پُری محفلیں اُجاڑ ہو گئیں۔ اُن کے دیکھتے دیکھتے اُجڑے دیار کی بزم آخر کے مایۂ ناز اہلِ کمال ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ دلی کا مرثیہ علامہ مغفور سے بڑھ کر کسی نے نہیں پڑھا۔ اگلے لوگوں کے مزار پر مصورِ غم سے زیادہ آنسوؤں کے پھول کسی نے نہیں چڑھائے! آہ دلی کی آخری بہار دیکھنے والی آنکھیں بھی بند اور فسانۂ شب سُنانے والی زبان بھی خاموش ہو گئی اور جو آخری شمع آنسو بہاتے بہاتے پگھل رہی اور ٹمٹماتے ٹمٹماتے آنسو بہا رہی تھی اب سال بھر ہو جائے گا کہ وہ بھی ختم ہو چکی۔

بربادیٔ دلی کے افسانوں اور اگلے لوگوں کی کہانیوں کا لطف حضرت مصورِ غم علیہ الرحمۃ کی زبانی جن لوگوں نے اُٹھایا ہے۔ یقیناً وہ اس مضمون کی نامکمل ہونے کے باوجود قدر کریں گے۔ یہ آخری نامکمل مضمون جہان آباد کے آخری بُلبُل خوش الحان کا نغمۂ ناتمام ہے جو درد مند دلوں کو تڑپا دے گا۔

رازق الخیری

کیسا مبارک ہوگا وہ وقت، جب جہاں آباد سے اُٹھنے والی ہستیاں جو اسی زمین کا پیوند ہوئیں اپنی قابلیت کے ڈنکے بجا رہی ہونگی! کہاں گئے ہوا کے وہ جھونکے جن میں ان پھولوں کی نشو و نما ہو رہی تھی اور کدھر رخصت ہوگئیں وہ زمزمہ سنجیاں جو زمین سے آسمان تک گونج رہی تھیں!

معمولی دھاگے گنٹھے بن کر چنبیلی اور موتیا سے مہک جاتے ہیں۔ روئی کے پھوئے گلاب اور حنا سے لپٹ کر دیبا و حریر کو معطر کر دیتے ہیں۔ کیسی خوش نصیب تھیں وہ آنکھیں جنہوں نے تاجدار ان علوم و فنون کو دیکھا۔ کیسے تاجدار جن کے تاج، تاج شاہی نہیں، تاجِ کمال تھے، جن کی چمک دمک آج بھی دنیا کو جگمگا رہی ہے۔ تاجدارانِ مغلیہ فنا ہو چکے مگر تاجداران سخن ہی نہیں ان کے کفش بردار ابھی زندہ ہیں، اور رہیں گے۔

چنتو ساقن جو بھنگ گھونٹ کر حُقّے پلاتی تھی حضرت امیر خسرو کے خاکِ پاکی بدولت اب تک زندہ ہے۔ شیخ نے اسی طرف کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ان درباروں کی جوتیاں سیدھی کرنے والے بھی کہیں سے کہیں پہونچ گئے

میں اس قدر خوش نصیب تو نہ تھا کہ جہان آباد کے دورِ بہار کا سماں میری نظروں سے گذرتا اور جن بُلبُلان خوش الحان کے نغمے کلیجوں کے پار ہو رہے تھے ان کی صدا پر لبیک کہتا! مگر میں نے اسی اُجڑی بستی کا

وہ وقت دیکھا ہے جب خزاں سرسبز و شاداب پودے اُجاڑ چکی تھی اور سُریلی آوازوں اور سدا بہار پھولوں کے بدلے فاختہ کی کُوکُو سوکھے ہوئے ٹھنڈ سے بلند ہوتی ہوئی میں نے سُنی ہے! ہائے جہان آباد!!

حکیم محمود خاں مرحوم کی نازک مزاجی ہندوستان بھر میں مشہور تھی ان کا مطب ایک میلہ تھا جہاں سینکڑوں مریض صحت یاب ہوتے تھے۔

اُستاد محترم مولانا حالی مغفور اُن کے مرثیہ میں فرماتے ہیں۔

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسہ جس قدر　　کرتے ہیں معلوم اُن سے جو جو امراض بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر　　اس کی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو نشتر تمام

نارسا تھیں دوربینیں اہل صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دُور بیں اس کی وہاں

اُستاد مکرم مولوی نذیر احمد مرحوم کی تنک مزاجی سے کون پڑھا لکھا واقف نہیں۔ اتفاق سے سرسید مرحوم نے ایک سب جج کو کسی شکایت کے سلسلہ میں دہلی بھیجا اور مولوی نذیر احمد کو لکھا کہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس لے جائیں۔

نزاکت طبع کے اعتبار سے نذیر احمد اور محمود خان ایک سے ایک بڑھے ہوئے تھے۔ نازک مزاجی کا اکھاڑا تیار ہو چکا تھا، اور دونوں کامل الفن دماغی طاقتوں میں چُور دنگل میں اُترنے کو تیار تھے۔ مزاج اس نزاکت میں ڈوبا ہوا تھا جس کی تہ میں شگفتگی کے جواہرات چمک رہے تھے۔ محمود خان مرحوم

حکیم و رئیس تھے۔ نذیر احمد مغفور ادیب و عالم، جہان آباد کی سرزمین جس نے میر تقی کی شکن آلود پیشانی کو بوسے دیئے تھے، اپنے دونوں سپوت گود میں لئے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

مولوی نذیر احمد مطب میں داخل ہوئے۔ ایک ایسی کڑک سے جو مطب میں گونج گئی۔ کہا

سلام علیکم

شریف خانی نفاست طبع اس کرختگی کی متحمل آسانی سے نہ ہو سکتی تھی۔ نہایت دھیمے سُروں میں "وعلیکم السلام" کی ایک آواز نکلی اور ختم ہو گئی۔

حکیم صاحب کے مطب میں اگر شہنشاہ ہفت اقلیم بھی موجود ہو تو وہ اس سے بات کریں گے نہ حال پوچھیں گے اور جب تک وار نہ آئے گا نبض نہ دیکھیں گے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کو نماز میں روتے اور بلبلاتے تو رات دن دیکھا مگر دعا میں جھومتے اور گڑگڑاتے خدا کے سامنے بھی نہ دیکھا۔ بغیر مصافحہ کئے بیٹھے اور بیٹھتے ہی فرمایا

ایک اُجڑی ہوئی صُحبت

انقلاب ۵۷ء کے بعد جب شاہجہان آباد پر انگریزی تسلط پوری طرح ہوگیا تو حکومت کا اثر محکوم پر پڑنا، تجدید تاریخ تھی۔ مذہب آہستہ آہستہ کمزور ہونا شروع ہوا، اور ادب اسی رفتار سے معاشرت میں داخل ہوتا رہا۔ جہان آباد کی سرزمین وہ جگہ تھی جس کی خاک سے ایسے علماء کا گروہ پیدا ہوا جن کی زندگی علم و فضل کے ڈنکے بجاگئی، اور جن کے کارناموں کے گیت آج بھی دنیا گارہی ہے۔ ان کی موت زندگی سے بہتر تھی۔ کہ ہر صبح کا آفتاب ان کی بوسیدہ قبروں کو بوسہ دیتا ہوا طلوع ہوتا ہے، اور روز روشن کی وداع سب سے پہلے ان کے مزاروں سے گلے ملتی ہے، مگر اب وہ دور فنا ہو رہا تھا۔

غدر کو پچیس تیس سال ہوگئے قرآن و حدیث کی درسگاہیں کمزور ہو رہی ہیں، ادب کے چرچے شروع ہوگئے گرمی کا موسم ہے، اور ایک شام کا ذکر ہے۔

شمس العلماء منشی ذکاءاللہ جو چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے، روزانہ شام کو

چھ بجے گھر سے نکلتے تھے، اور ٹاؤن ہال آجاتے تھے۔ (یہ کمپنی باغ میں تھا جہاں اب کمیٹی کا دفتر ہے) بتاشوں کی گلی سے مولوی نذیر احمد، دریبہ سے ماسٹر پیارے لال، اور اکثر رہٹ کے کنوئیں سے مولوی ضیاء الدین بھی آتے تھے۔ منشی ذکاء اللہ اگر جلدی نکل آتے تھے، تو مولوی نذیر احمد کے ہاں پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ جس شام کی یہ صحبت ہے اُس روز مولوی نذیر احمد صاحب کے مکان پر منشی ذکاء اللہ آ گئے تھے۔ میں کچھ رشتہ کے کچھ شاگردی کے تعلق کی وجہ سے زیادہ وقت مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں بسر کرتا تھا۔ یہ دونوں بزرگ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ محض اتفاق سے مولانا آزاد تشریف لے آئے۔ مولوی نذیر احمد صاحب ٹاؤن ہال پیدل جاتے تھے، اور آٹھ نو بجے تک تشریف رکھتے تھے۔ ان کے پاس وکٹوریہ گاڑی تھی، کبھی کبھی ہوا خوری کو اس میں نکل جاتے تھے۔ اس دن مولانا آزاد کے آنے پر اُنھوں نے گاڑی کا حکم دیا۔ اور تینوں باھر نکلے۔ میں ہم رکاب تھا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھنے میں کچھ دیر تکلف رہا، آخر میں اور مولوی ذکاء اللہ سامنے، اور مولوی نذیر احمد اور مولانا آزاد بڑی سیٹ پر بیٹھے۔ کھاری باؤلی میں مولانا حالی سے ملاقات ہوئی مولانا آزاد کے اصرار پر وہ بھی اندر تشریف لے آئے۔ اور ہمارے برابر بیٹھ گئے۔ میں اس وقت شاید نویں جماعت میں تھا، اور مولانا حالی سے پڑھتا تھا۔ ہمارا زمانہ طالب علمی آج کے زمانہ سے مختلف تھا۔ آج کے اُستاد برابر کے دوست ہیں اُس وقت ڈر کے مارے استاد کے سامنے آنکھ اُٹھانی بھی مشکل تھی، میں

شکو رہا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا، کہ آگے جا کر کوچوان کے پاس بیٹھ جاؤں لیکن اجازت نہ ملی۔

گفتگو شعر شاعری پر ہونے لگی، اور ذوق و غالب کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہم لاہوری دروازہ سے باہر پہنچے یہ مقام اس وقت گلزار بنا ہوا ہے، دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں ہیں، گنجان آبادی ہے۔ منڈی ہے دوکانیں ہیں اُس وقت جنگل بیابان تھا۔ جہاں ایک مسجد کے سوا جو شائد ابھی تک موجود ہے، کچھ نہ تھا۔ ایک طرف کچھ لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف کبڈی ہو رہی تھی۔ اور سڑک کے برابر مداری تماشہ کر رہا تھا۔

زندگی ان لوگوں میں بھی تھی۔ مولانا آزاد کی تحریک مولوی نذیر احمد کی تائید، اور منشی ذکاء اللہ صاحب کی خواہش پر گاڑی ٹھہرائی گئی، اور مداری نے پوری طاقت سے اپنے کرتب دکھانے شروع کئے مولوی نذیر احمد، اور مولانا حالی، میرے اُستاد تھے۔ مولانا آزاد اور منشی ذکاء اللہ واجب الاحترام بزرگ۔ اس لئے میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں مجھے تعجب ضرور ہے، کہ یہ مداری کے اِس راگ میں باوجود اِس علم و فضل کے کیونکر آ گئے، کہ وہ سانپ، اور نیولے کی کشتی دکھائے گا مگر مداری کا راگ اور چیز ہے، اور ان کی قابلیت دوسری چیز۔ یہ آخر وقت تک یہی سمجھتے رہے، کہ کشتی اب ہوئی۔ حالانکہ اُس کے پاس ایک نیولا، اور ایک سانپ تھا، ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک زخمی ہوتا، اگر مداری اِس طرح روز کشتیاں دکھاتا تو اُس کو ایسا کیا مل جاتا، کہ روز سانپ اور نیولے لاتا۔ ایک چونی مولانا

آزاد نے اور اسی طرح تلینوں نے دو دو آنے یا چار چار آنے دے، اور مداری سب پیسے خلتے میں رکھ سیدھا ہو لیا۔ ان سب نے کہا کہ کشتی دکھاؤ مگر وہ ہنس کر ٹالتا ہوا یہ جا وہ جا۔

گاڑی میں کچھ دیر مداری کے متعلق بحث ہوتی رہی، آخر مولوی نذیر احمد نے وہی غالب' و ذوق' کا مضمون شروع کر دیا، مولانا حالی' کا واسطہ غالب سے تھا، اور مولانا آزاد' کا ذوق' سے دونوں بزرگ اپنے اپنے ثبوت پیش کر رہے' اور منشی ذکاء اللہ' اور مولوی نذیر احمد، بحث کے مزے لوٹ رہے تھے۔

مولانا آزاد نے فرمایا نثر ہو یا نظم اگر لطف زبان نہ ہو تو بے کار ہے۔

مولوی حالی کی رائے تھی، کہ زبان کا لطف ہو تو سبحان اللہ، مگر اصلی جوہر تخیل ہے، اگر یہ نہیں تو محض زبان کو لے کر چاٹا کیجیے۔

مجھے تعجب ہے، کہ ان بزرگوں کی نظر کس قدر وسیع، حافظہ کیسا پختہ اور ذہن کیسا رسا تھا، طرفین سے سینکڑوں شعر برسنے لگے۔

مولانا آزاد نے سینکڑوں شعر نواب مرزا شوق کے پڑھ ڈالے، میر حسن، اور مرزا شوق کا مقابلہ تھا، فراق کی کیفیت میں مولانا آزاد نے شوق کا یہ شعر پڑھا۔

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی

نہ صورت رہی وہ نہ رنگت رہی

اِس شعر کی چاروں نے داد دی، مولانا حالی نے اسی کیفیت میں

میر حسن کا یہ شعر فرمایا۔

نہ ملنے کے دُکھ اس کے سب ہیں سہے
مگر اپنے جی سے وہ جیتا رہے

اس کی صراحت مولانا نے کچھ ایسے الفاظ میں کی، کہ سب آب دیدہ ہو گئے میں اس وقت تو خاک نہ سمجھا مگر اب اس شعر کا لطف آتا ہے۔ سبحان اللہ۔ محبت کی اس سے زیادہ کیفیت کیا ہوگی۔

"مگر اپنے جی سے وہ جیتا رہے"

اِس کے بعد پھر وہی غالبؔ اور ذوقؔ کے شعر کی گردان، اور لُطف زبان کی رَٹ شروع ہوئی، ذوقؔ کے اِس شعر پر سب نے بے ساختہ مرحبا کہا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
سر بہ وقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے

زبان کے اعتبار سے مولانا حالیؔ نے غالبؔ کے بہت سے شعر پڑھے مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن اُن کے اِس شعر کو سب نے پسند کیا۔ اور نزاکت خیال کی داد دی۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

یہ متبرک صورتیں جن پر ادب موتی نچھاور کر رہا تھا، اور جو کوثر سے دُھلی ہوئی زبانیں لے کر پیدا ہوئے تھے، میرے سامنے پیوند خاک

ہوئی ہیں۔ جہاں آباد کے ایسے ایسے تماشے میری آنکھ سے اوجھل ہوئے ہیں کہ دل اُن کی یاد سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی گرج جس نے آسمان اسلام کے اچھے اچھے بادلوں کو خاموش کر دیا تھا۔ ختم ہو چکی۔ میدان تقریر کے اس شیر نے جس کی دہاڑ سے آسمان و زمین گونج اُٹھتے تھے، میرے سامنے دُنیا سے مُنہ موڑا۔ میں آخر وقت بالین پر موجود تھا، اور دیکھ رہا تھا، کہ جس کی تقریر و تحریر جادو کر رہی تھی، وہ موت کے چنگل میں پھنسا ہوا دنیا سے وداع ہو رہا ہے!

میں اس مشاعرہ میں موجود تھا، جہاں مرنے والا داغ، مولانا حالی پر چھا رہا تھا، اور اس نے اپنے اس شعر سے مولانا کو رونکھا کر دیا تھا،

تم بھی اے ناصح کسی پر جان دو
ہاتھ لا اُستاد، کیوں کیسی کہی

میں نے اُسی رات کے آخری حصّہ میں وہ سماں بھی دیکھ لیا، کہ دلّی پرست داغ جو مولانا سے پخ مچا رہا تھا اِس شعر پر ڈاڑھیں مارتا ہوا اُن کے قدموں پر آپڑا۔

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اِس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

عصمت، ۱۹۳۵ء

دِلّی کے کھنڈروں سے ایک صدا

شاہجہان آباد اُجڑ چکا مگر اس کے کھنڈرات اب تک سننے والوں کے کارنامے سُنا رہے ہیں اور شہر کے در و دیوار۔ اس وقت بھی اپنے مہمانوں کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ آج سے اسّی سال پہلے دلّی کیا تھی، بادشاہ کا جلوس، قلعہ معلّٰی کی بہاریں، شاہی جھگڑے، میلے تماشوں کے رنگ، دربار کی کیفیت، قطب صاحب کے مقبرے، پیر غیب، شاہ برڑے، اور کوٹلہ کے جشن، شہری آبادی کی چہل پہل، ہندو مسلمانوں کی معاشرت۔ رمضان، عید، سلونو، سالگرہ کے جشن شادی بیاہ کی رسوم۔ غرض دور گزشتہ کی بہار دیکھنی ہو تو حضرت مصورِ غم علیہ الرحمۃ کی مشہور تصنیف۔

نوبت پنج روزہ یعنے وداعِ ظفر

ملاحظہ فرمائیے جس میں آخری تاجدار مغلیہ کی پانچ نوبتیں اس قدر درد انگیز پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ خون کے آنسو رلوادیں گی۔ پانچویں نوبت وہ ہے جب دلّی نے بادشاہ کو وداع کیا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات، مخبروں کا ظلم، مظلوموں کی حالت زار۔ مردوں کی بربادی عورتوں کی تباہی اور بادشاہ کے پیہم مصائب۔ ناممکن ہے کہ آپ آنسو بہائے بغیر پڑھ سکیں بادشاہ کی تصویر اور تین عکسی نادر تحریریں بھی دی گئیں ہیں۔ ہزاروں جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل چکیں۔ چوتھا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ/)

غدر کی ماری شہزادیاں

یا "بیلہ میں میلہ" ۱۸۵۷ء کے غدر کی لٹی ہوئی شہزادیوں کی دل دہلا دینے والی آپ بیتی۔ غدر نے دلی کی بیگمات پر جو قیامت توڑی تھی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے قلعہ معلی کی رہنے والیوں نے در در بھیک مانگی جن کے دستر خوان سے جانوروں کے پیٹ بھرتے تھے۔ متواتر کئی کئی وقت انھوں نے فاقے کئے اور کھیل کا دانہ تک میسر نہ ہوا۔ جو سونے چاندی میں کھیلتی تھیں وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئیں۔ ان کی دردانگیز داستان انھیں کی زبان میں اور پھر حضرت مصور غم کا بیان! ایک لفظ دل میں گڑتا اور کلیجہ کے پار ہوتا ہے بے گناہوں کی پھانسیاں، تخت و تاراج والوں کی بے گور و کفن لاشیں، مجبوروں کے مظالم، بچوں کے جگر خراش نالے، عورتوں کی بے چارگی اور بے کسی اور شہری آبادی کی بربادی، غرض اس داستان کا ہر ہر صفحہ درس عبرت ہے۔ اوپر تلے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں کئی کئی رنگ کی تصویریں بھی ہیں۔
قیمت صرف بارہ آنے (۱۲)

بزم رفتگاں

اردو ادب کے غیر فانی نثر کے مرثیے جو ملک کی مایۂ ناز خواتین اور باکمال شعراء اور ادبا کی یاد میں لکھے گئے تھے، اور جو معدن ادب کے بیش بہا جواہر ریزے ہیں حضرت علامہ مغفور کا یوں تو ہر مضمون تاثیر سے لبریز ہوتا ہے مگر بزم رفتگاں کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک جملہ درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ قیمت (دس آنے) (۱۰/)

عروس مشرق

یورپ کی اندھا دھند نقالی اور مغربی تہذیب کے زہر آلود اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے گذشتہ چوتھائی صدی میں حضرت مصور غم نے اپنے مخصوص طرز بیان میں جو مضامین تحریر فرمائے تھے ان کا مجموعہ ان مضامین میں ان مشرقی خوبیوں کو جو روز بروز مٹ رہی ہیں، اور جن پر ہندوستان کے بسنے والے ناز کرتے تھے، موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے قیمت

مصوّرِ غم

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) شاہجہاں آباد کے اُس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ کے اُستاد ہونیکا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا جس نے مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبد الرب مغفور بانی جامع مسجد سہارنپور جیسے جید علماء اور قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ اجڑے دیار کا وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظ، حاجیہ، قاریہ ام عطیہ النساء مرحومہ (چھوٹی استانی جی) اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے۔ حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبد الواجد صاحب نے حیدرآباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے، انتقال فرمایا۔ اور حضرت علامہ مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مغفور نے اردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد مرحوم (جو علامہ مرحوم کے حقیقی پھوپا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند لگا دیے۔ ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبد الحلیم صاحب بانی جامع مسجد جھجر کی اکلوتی صاحبزادی سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی۔ اور ۱۸۹۱ء میں محکمۂ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی۔ اور دفتر کے خشک کاموں میں جی نہ لگتا تھا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ دنوں کے لئے گوارا نہ کرسکتی تھیں۔ ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی۔ اور ترقی کے نہایت اعلیٰ مواقع میسر آنے پر ان کی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی۔ اور سانا دین پور، میرٹھ، علی گڈھ، دہرہ دون

ب

کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبدیل ہوئے مگر چند سال گذرے تھے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ" یا "صالحات" ہے جو سنہ ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی سنہ ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف "منازل السائرہ" ختم کی۔ ان دونوں اصلاحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ مصنف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ سنہ ۱۹۰۳ء سے رسالہ "مخزن" میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔ پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی اور دلی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلآویزی، زبان کی شیرینی، اور واقعات کے پیرایہ بیان کی دردانگیزی کی دھوم مچنے لگی۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" جاری کیا جو ۲۸ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زنانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ "تمدن" جاری کیا جو ۵ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ سنہ ۱۵ء میں اخبار "سہیلی" جاری فرمایا مگر سنہ ۱۶ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگی اور سہیلی جاری نہ رہ سکا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں "شام زندگی" شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی، اس کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوایا۔ اب اردو کے بےمثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا اور دو درجن کے قریب ضخیم کتابیں سنہ ۱۷ء سے سنہ ۲۳ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں جو مختلف حضرات نے شائع کیں۔ اور بقول ایک ادیب "لاکھوں روپیہ پیدا کیا"۔ حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اردو کے کسی مصنف کو دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ "صبح زندگی" "شام زندگی" وغیرہ کے تو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں "آمنہ کا لال" "سیدہ کا لال" بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزارہا کی تعداد میں پانچ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کورس علامہ مغفور سے صحیح کرائے سنہ ۱۹۲۰ء میں نیشنل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو ممتحن مقرر کیا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں حکومت بہار واڑیسہ نے شمالی ہند سے بحیثیت ماہر اردو کے اردو ہندی کی ترقی کے سلسلے میں حضرت مرحوم سے مشورے لئے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں مسلمان بچیوں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم و نادار بچیوں نے بحیثیت بورڈر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں

اس مدرسہ کے لئے بیگم صاحبہ محترمہ کے ساتھ علامہ مغفور باوجود پیرانہ سالی کے ہندوستان کے کسی صوبہ کا سال میں مہینہ سوا مہینہ کا دورہ فرماتے تھے۔ مدرسہ کے کاموں میں محترمہ بیگم راشد الخیری صاحبہ حضرت علامہ مرحوم کی برابر کی شریک رہیں۔ ۱۹۰۸ء میں مسلمان بچیوں کے لئے رسالہ "بنات" جاری فرمایا۔ ۱۹۰۹ء میں علامہ مغفور کی مرحومہ بہو محترمہ خاتون اکرم کی یادگار میں زنانہ دستکاری کا رسالہ "جوہر نسواں" جاری ہوا۔ حضرت علامہ راشد الخیری کی (خدا انہیں غریق رحمت فرمائے) خودداری بڑے آدمیوں اور باا ثر و بارسوخ لوگوں سے ملنے جلنے کو کبھی درست نہ سمجھتی تھی۔ نام و نمود شہرت و خودستائی جلسوں اور بے نتیجہ تقریروں سے سخت نفرت تھی۔ کسی جلسہ یا کسی تحریک میں حصہ نہ لیتے تھے۔ حضرت مصور غم نے خاموشی کے ساتھ مسلسل چالیس سال تک تصانیف اور رسالوں کے ذریعہ خواتین ہند اور ادب اُردو کی جو زبردست شاندار خدمات انجام دیں وہ اس قدر گراں بہا اور عظیم الشان ہیں کہ مشہور ادیبوں اور رہنمایان قوم کا فیصلہ ہے کہ ان کی نظیر نہیں نکل سکتی۔ اصلاح نسواں اور حقوق نسواں کے لئے حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی کوششیں کبھی فراموش نہ ہو سکیں گی۔ مصور غم ہی کی تحریروں سے عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کے دل پسیجے مصور غم ہی کے لٹریچر سے عورتوں کو اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور گذشتہ تہائی صدی میں خواتین ہند میں جو تھوڑی بہت بیداری پیدا ہوئی ہے متفقہ طور پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس میں بہت بڑا حصہ جنت نصیب حضرت علامہ راشد الخیری کی اَن تھک مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت مصور غم علیہ الرحمۃ مشرق کے بےمثل حزن نگار مصنف ہی نہ تھے مزاحیہ مضامین لکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ناولسٹ بھی تھے، جرنلسٹ بھی، مختصر افسانہ نگار بھی تھے، شاعر بھی تھے، اور انشا پرداز بھی، مگر ہر حیثیت میں مصلح اور نسوانی جذبات کے ترجمان۔ ان کی تحریر کی طرح ان کی تقریروں اور لکچروں میں بھی خدا نے کچھ ایسا اثر اور آواز میں کچھ ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ مجمع زار و قطار آنسو بہاتا تھا۔ حضرت علامہ مغفور میں مذہبی عنصر بہت غالب تھا۔ زمانۂ شباب میں علاوہ مذہب کے فارسی شاعروں اور انگریزی مصنفین کا بھی مطالعہ فرمایا تھا، حافظہ حیرت انگیز تھا۔ موسیقی سے بہت دلچسپی تھی انگریزی اور ہندوستانی بہت سے کھیل جانتے تھے۔ بدن کسرتی تھا، جسم دوہرا، قد لمبا، چہرہ پر دلالت اور نور برستا تھا خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی۔ اور دیکھنے والوں کے لئے ہر حیثیت سے قابل رشک تھی۔ بےنظیر بیٹے، لاجواب بھائی، سعادتمند داماد، بےمثل شوہر، عاشق زار باپ، اور بہترین دوست ہمیشہ شاداں و خنداں رہتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور زندہ دلی ان کے ملنے والے

بھلانے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جن کی قابلیت کا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا۔ جن کی شہرت اس دور کے بڑے بڑے مصنفوں اور رہنماؤں کے لئے باعث رشک تھی، جن کا نام عزت کے ساتھ جنکا ذکر محبت کے ساتھ لیا جاتا، اور کیا جاتا تھا۔ ان کی شرافت اور اخلاق سادگی اور وضعداری، مہمان نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالدیتی تھی ان کی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۶۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع ہوگئیں۔ لیکن کسی کتاب میں تصویر شائع نہ کرنے دی۔ کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے۔ ورنہ سوائے ٹائیٹل پر نام آنے کے اپنا نام تک اپنی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر و شکر توکل و قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمدلی مخلصانہ عملی ہمدردی، غیروں کی آگ میں کود پڑنا۔ دوسروں کے لئے سب کچھ لٹا دینا المختصر خدمت خلق اللہ حاصل عمر تھا۔ ۶۸ سال کی عمر تھی اور بظاہر صحت نہایت اچھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر ۳ فروری ۳۶ء کی منحوس صبح کو اجڑے دیار کے آخری باکمال مصنف کا سایہ قوم بدبخت کے سر سے اٹھ گیا۔ مصور غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کہرام مچ گیا جگہ جگہ زنانہ اور مردانہ ماتمی جلسے ہوئے اور ہندوستان کے باہر ادب اردو کا ذوق رکھنے والا ہر شخص دم بخود ہوگیا۔ جس قدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین جتنے مرثئے نوحے قطعات تاریخ المختصر جس قدر بلند پایہ ماتمی لٹریچر مصور غم کے انتقال پر شائع ہوگیا وہ اتنا زبردست ہے کہ بقول اڈیٹر ملت "کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر اس وقت تک شائع نہ ہوسکا" آسمان کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمین کتنے ہی چکر کاٹے، ہندوستان بدلے ہندوستان والے بدلیں، معاشرت بدلے ادب بدلے لیکن مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کو ہمیشہ عزت و محبت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ اور ان کا نام آنے والی نسلیں فخر کیا کرتی رہیں گی۔ خدا کی بیشمار رحمتوں کے پھول اس مزار مبارک پر برستے رہیں جس میں وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے۔ جس کی دائمی مفارقت ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہے۔

رازق الخیری

۲۲ جولائی ۳۶ء